کلیاتِ
سعید قیس



کلیات

سعید قیس

مرتبین

خرم اقبال عباسی

طاہر عظیم

انجمن فروغِ ادب بحرین

سن اشاعت	۲۰۱۶ء
تعداد	۵۰۰
سرورق	سارہ سامی
حروف چینی	طاہر عظیم
قیمت :	-/1500 روپے
بحرین :	10 بحرینی دینار

انجمن فروغِ ادب بحرین

انتساب

اپنی شریکِ حیات کے نام

پیش نامہ

جب ہم نے جشن سعید قیسؔ کے انعقاد کا فیصلہ کیا تو آپ کی کلیات کی اشاعت کا بھی خیال آیا۔ دوستوں سے مشاورت کے بعد ہم نے اس کام کی ذمہ داری لی، جو بظاہر تو آسان مگر اتنا آسان بھی نہ تھا۔ کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، ترتیب اور پھر اس کی اشاعت اتنی قلیل مدت میں کرنا حقیقت میں بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ پہلے ہی مرحلے میں احمد عادل صاحب نے اس کی طباعت و اشاعت کے جملہ اخراجات کی ذمیداری قبول کر لی۔ کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ بھی آسانی سے ہوگئی۔ یہ نہایت ہی دقیق، نازک اور توجہ طلب کام تھا۔ صد شکر اس ذات پاک کا کہ ہم نے یہ مرحلہ بھی آسانی سے طے کیا۔ کلیات کی اشاعت کی سلسلے میں قیسؔ صاحب کے بچوں بلخصوص آپ کی صاحبزادی محترمہ نجمہ صاحبہ نے بہت شفقت سے ہمارا ساتھ دیا اور رہنمائی فرمائی۔

قیسؔ صاحب طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے اپنی ذات سے اس قدر غافل ہیں کہ اپنا غیر مطبوعہ کلام بھی یکجا نہیں کر پائے۔ اس کلیات میں جو کچھ غیر مطبوعہ کلام شامل کیا جا رہا ہے، وہ منتشر اوراق احباب سے جمع کئے ہیں۔ قیسؔ صاحب ایک پختہ کار شاعر ہیں۔ اس کتاب میں اگر کوئی سقم نظر آئے تو اس کی ذمہ داری قیسؔ صاحب پر عائد نہیں ہوتی بلکہ اسے ہماری کوتاہی سمجھی جائے۔

کلیات سعید قیسؔ دنیائے اردو بلخصوص بحرین پر ایک قرض تھی جو آج الحمد للہ ادا ہو گیا ہے۔ انجمن فروغ ادب اس کلیات کی اشاعت پر فخر محسوس کرتی ہے۔

انجمن فروغ ادب، بحرین

00973 39220739

anjumanfarogheadab@gmail.com

سعید قیس انسانی جذبہ و احساس کا عکاس اور ترجمان ہے۔ وہ غزل کے لہجے میں ان کیفیات کی اتنی سچی، اتنی کھری اور اتنی خوبصورت تصویریں کھینچتا ہے کہ دورِ حاضر کے شاید ہی کسی غزل گو کو اس طرزِ اظہار تک رسائی حاصل ہو سکی ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ سعید قیس گزشتہ طویل عرصے سے اپنے وطن سے دور ارض بحرین میں مقیم ہونے کے باوجود یہاں کی حیاتی فضا اور غزل میں پے در پے شامل ہوتے ہوئے نئے امیجز اور نئی علامات و تشبیہات سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس کا ثبوت اس کی یہ غزلیں ہیں جو ایوانِ غزل میں کئی جدید نوعیت کے دریچے وا کر رہی ہیں اور آنے والی صدی کے کتنے ہی امکانات سمیٹ رہی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

سعید قیس کی ابتداء بھی میرے سامنے ہے اور انتہا بھی۔ اس کا ماضی لاہور سے عبارت ہے اور حال بحرین سے۔ وہ لاہور میں بھی ایک الگ بانکپن سے شاعری کر رہا تھا اور بحرین میں بھی اپنی انفرادیت کا علم بلند کئے ہوئے ہے۔ وہ مشاعرے میں نظر آئے یا کاغذ پر جلوہ گر ہو دونوں صورتوں میں اسے بہت اچھا شاعر تسلیم کرنا پڑتا ہے اور یہ کہنے کی تو شاید ضرورت نہیں کہ اس جیسے اچھے انسان کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ خدا اس کے فن اور عمر کو مزید درخشندگی بخشے۔

قتیل شفائی

غزل کہنا عمر بھر کا کام ہے جب ایک بار آپ یہ فیصلہ کر لیں کہ آپ کو غزل کہنی ہے تو پھر کئی برس تو اس فن کی مبادیات سیکھنے میں گزر جاتے ہیں۔ کوئی بیس پچیس برس بعد یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ آپ نے اس فن کو سیکھا بھی ہے کہ نہیں؟

سعید قیس کی غزل پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک طویل ریاضت میں

سے گزرے ہیں۔ انہوں نے غزل کی اجتماعیت کو بھی قبول کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی راہ بھی نکالی ہے مرکز سے دور رہ کر ریاضت جاری رکھنا بہت مشکل کام ہے جوں جوں دنیا کے جھمیلے وسعت پذیر ہوتے جاتے ہیں۔ شاعری سکڑتی چلی جاتی ہے شاعری کو شاید اسی لئے درویشی کہا گیا ہے کہ وہ دنیاوی زنجیروں سے بے نیاز ہو کر اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ سعید قیسؔ نے اپنے سفر کو ہر حالت میں جاری رکھا، وہ جہاں بھی گیا اپنا صحرا ساتھ لے گیا۔

قیسؔ ہی رکھ لیا جب اپنا تخلص ہم نے
کنجِ آغوش میں اک دامنِ صحرا رکھا

شہزاد احمد

سعید قیس کی شاعری نیلے ساحلوں کی دھند آلود فضا میں پھڑ پھڑاتے آبی پرندوں کی طرح ہے۔ اس کی خوبصورتی دل میں دبے پاؤں اترتی چلی جاتی ہے شاعری میں دکھائے جانے والے مناظر شاعری اور قاری کا مشترکہ اثاثہ ہوتے ہیں۔ ان میں ایک منظر دکھایا اور ایک چھپایا جاتا ہے۔ جس سے وہ فضا وجود میں آتی ہے جو نیلے ساحلوں کی دھند آلود فضا میں پھڑ پھڑاتے آبی پرندوں کو دیکھنے اور نہ دیکھنے کی درمیانی کیفیت سے پیدا ہوتی ہے۔ سعید قیسؔ کے ہاں پائی جانے والی یہی کیفیت اس کی شاعری کے اسرار کو گہرا کرتی ہے۔

وہ لفظوں کے حسن اور بدصورتی سے پوری طرح آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ ان لفظوں کا صحیح استعمال ان کی ہیئت تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے وہ جدید اور قدیم کے فرق سے بھی آگاہ ہے اور ان رویوں کو ایک نئی شکل دینے پر بھی قادر ہے۔ چنانچہ اس کی شاعری اس عہد میں ہونے والی شاعری سے الگ بھی ہے اور اس کے عین درمیان میں آباد بھی ہے۔ خدا کرے سعید قیسؔ کا بسایا ہوا رنگوں، خوشبوؤں اور آوازوں کا یہ طلسماتی اور انوکھا شہر آباد رہے۔

عطاء الحق قاسمی

کلیات میں شامل شعری مجموعے

مع

اقتباسات استنادِ اکابرین واعترافِ معاصرین

حدیثِ غم

سعید قیس

فہرست

……O……

نُصرت کے نام

غم کے عنواں بدل گئے لیکن
تُم کہانی کے ساتھ ساتھ رہے

یادش بخیر

''حدیثِ غم'' سعید قیسؔ کے شعری تجربوں کی معروضی شکلیں ہیں اور ان تجربوں کے پیچھے زندگی کا گہرا شعور ملتا ہے۔ وہ اپنی انفرادی واردات کو جب بیان کرتا ہے تو اُس میں بھی انسانی خواہشوں، جذبوں اور دکھوں کا خوبصورت اظہار ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ شاعر سعید قیسؔ زندگی کے راستوں میں بکھرے ہوئے دُکھ کے کانٹوں کو بھی زندگی کا انمول تحفہ سمجھتا ہے۔

اُس کے نزدیک غم واندوہ ہی زندگی کا انمول سرمایہ ہیں۔ اور شاعر اپنے اس سرمایہ پر حد درجہ نازاں ہے وہ رومانی افسردگی میں چھپے ہوئے شاعروں کی طرح غم واندوہ پر احتجاج نہیں کرتا اور نہ ہی اُن کے سامنے شکست خوردگی کا اظہار کرتا ہے بلکہ وہ جس کرب میں مبتلا ہے یا حالات وواقعات نے جو غم اُسے بخشے ہیں اُنہیں شعورو ادراک کی روشنی میں اس لئے قبول کرتا ہے کہ یہ غم زندگی کا حصہ ہی نہیں ہیں بلکہ انسانی عظمتوں کے رازدار ہیں۔ وہ تڑپ کے شعلوں میں گِھر کر سکون تلاش کرتا ہے اور اگر اس تڑپ کے شعلے سرد ہو جائیں تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

دولتِ کرب چھن گئی جب سے
زندگی کا وقار ہی نہ رہا

کسی کا قول ہے کہ انسان فطرتاً شاعر ہے اور شاعر فطرت کا ترجمان ہے۔ اس قول کی صداقت میں ہمیں ایسے شواہد ملتے ہیں جن کے ڈانڈے اُس دور سے ملتے ہیں جب کائنات سائنسی ترقیوں کے تصور سے بھی آشنا نہ تھی لیکن اظہار کے تمام تر موجود ذریعوں میں شاعری اور موسیقی ایسے ذرائع تھے جو اپنے جمالیاتی کردار کی

بدولت انسانی فطرت کا حسین ترین حصہ تھے اور جب ہم زمانہ قدیم کے شعری ادب، سیاست اور الہیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان تحریروں میں اسلوبِ بیان، تشبیہات اور دلائل اس حد تک شاعرانہ محسوس ہوتے ہیں کہ شعور وادراک کی وسعتوں میں جمال ہی جمال بکھر جاتا ہے۔

شعور مغربی شاعر کالرج کی رائے میں شعر انشا کی وہ نوع ہے جو سائنس کی مدّ مقابل ہے اس کا مقصد انبساط پیدا کرنا ہے اور ورڈ زورتھ کا خیال ہے کہ شاعر انسان اور فطرت کا عکس ہے اور شدید جذبات کا ازخود چھلکنا ہے شعری ادب کے متعلق ہمیں کئی ایسے اقوال ملتے ہیں جن سے شاعری کی عظمت اور اہمیت کا پتہ چلتا ہے اور شاعر کی شخصیت اور کردار کے ایسے خطوط متعیّن ہوتے ہیں جس سے وہ معاشرتی انسان کے مقابلے میں بہت زیادہ اہم اور خاص حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔

عام حالات میں شاعر کا فکری سرمایہ ہی ہمارے سامنے آتا ہے اور شاعر کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی ہم اس کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں سے آشنا ہوجاتے ہیں اور شاعر کی شخصیت کو متعارف کروانے میں اس کا تخلیقی سرمایہ اپنا فرض بخوبی ادا کرتا ہے۔

زیرِنظر مجموعہ حدیثِ غم پر تبصرہ کرتے ہوئے میرے سامنے نہ صرف شاعر کا تخلیقی سرمایہ ہے بلکہ اس کی شخصیت کے تمام تر پہلوؤں سے آشنائی کا دعویٰ بھی ہے اور اس دعوے کا ثبوت یہ ہے کہ شاعر سعید قیسؔ میرا دوست ہے اور اس سے میری دوستی کی عمر خاصی طویل ہے۔

وہ مجھے زندگی کے اُس دور میں ملا جب میں صرف علمی ادبی حلقوں میں پڑھنے کے لئے افسانے لکھتا تھا اور سعید قیسؔ سے میری ملاقات کا سبب اُس کے شعر تھے اور

یہ ملاقات ایک ٹھوس رفاقت میں تبدیل ہوگئی۔ ہم دونوں لاہور کی سڑکوں پر ایک ساتھ گھومتے ہوٹلوں میں گھنٹوں باتیں ہوتیں اور علمی و ادبی حلقوں میں ایک ساتھ شرکت کرتے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک روز اُس نے لاہور کے مرحوم حلقہ اربابِ عالم میں ایک غزل تنقید کے لئے پیش کی اور جب دستور کے مطابق غزل کی کاپیاں اربابِ تنقید میں تقسیم کردی گئیں تو مجھ پر ایک عجیب سا ہیجان طاری تھا کیونکہ سعید قیؔس اپنی شاعری کے بارے میں بے حد حساس اور جذباتی تھا۔ میں اس وجہ سے پریشان تھا کہ اگر کسی نے ذرا سی بھی بات کہہ دی تو یہ سعید قیؔس کے لئے صدمہ بن جائے گی اور مجھ سے شاعر دوست کی افسردگی دیکھی نہ جائے گی کیوں کہ کالرج کی رائے کے مطابق سعید قیؔس کی شاعری اس کے از خود چھلکے ہوئے جذبات واحساسات کی منظم صورت تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے موضوع اور اسلوبِ بیان کے سلسلے میں کسی ہمعصر سے متاثر نظر نہیں آتا تھا اُس پر ایک عجیب قسم کی محویت طاری ہوتی تھی اور اس کی نیم براؤن (بھوری) آنکھوں میں فنّی خلوص کی چمک ہر نئے ملنے والے کو اتنا متاثر کرتی تھی کہ وہ سعید قیؔس سے گہری دوستی کے رشتہ میں منسلک ہوجاتا تھا۔

علمی و ادبی حلقوں میں آنے جانے سے وہ لاہور کے تمام ادیبوں شاعروں میں ایک جانی پہچانی شخصیت بن گیا۔ دراز قد، کھلتے ہوئے رنگ اور سنہری گھنگریالے بالوں والا یہ شاعر جسے دیکھ کر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ وہ ایک ایسا شاعر ہے جسے نیکی، سچائی اور پاکیزگی سے عشق ہے اگرچہ اس کے شعروں میں رومانی افسردگی کا عنصر غالب تھا مگر عشق کی عظمتوں اور فراق کی لذّتوں کو اتنے لطیف پیرائے میں بیان کرتا تھا کہ سننے والے اس کے جمالیاتی شعور سے بے پناہ متاثر ہوتے

تھے۔

اُس وقت بھی ہمارے اکثر دوستوں کا خیال تھا کہ سعید قیسؔ بہت جلد ادبی زندگی میں ایک اہم مقام حاصل کرے گا۔ قدرت نے اُسے جمالیاتی شعور سے فراخدلی سے نوازا تھا اور وہ اپنے جمالیاتی جذبات واحساسات کو اس خوبصورتی سے شعری قالب میں ڈھالتا تھا کہ اس کی فنی مہارت پر ایک کہنہ مشق شاعر کا گمان ہوتا تھا۔ شاعری دراصل چند انسانی جذبوں کا بھی نام ہے اور انسان تو بنیادی طور پر جذبات کا پیکر ہے لیکن ان کے اظہار کی قوت صرف چند انسانوں کو عطا ہوتی ہے اور سعید قیسؔ جہاں جذبات واحساسات کا ایک طوفان تھا وہاں اس کے اظہار کی قوت کا بھی پتہ چلتا تھا اور میں اُس وقت کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا جب میرا شاعر دوست شعری ادب میں کسی انقلاب کا داعی بن کر سامنے آئے گا۔ لیکن اپنے خوبصورت جذبوں کی حسین وادی میں وہ غمِ زمانہ کی آندھیوں سے محفوظ نہ رہ سکا اور لاہور کا یہ البیلا شاعر اپنے شہر کے گلی کوچوں بازاروں اور لوگوں سے جدا ہو کر بہت دور چلا گیا۔

لاہور اس کی یادوں کی ایک طویل کہانی ہے اور اس کہانی نے ایک لمبے فاصلے اور وقت کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ میں اس کہانی کو ابھی نہیں لکھنا چاہتا لیکن کبھی کبھار کھارے سمندروں اور وادیٔ نجد کے ریتیلے میدانوں میں جانے والے سعید قیسؔ کا خیال آجاتا تو میں اس شاعر کے بارے میں سوچنے لگتا جس کا یہ شعر مجھے اکثر یاد آجاتا تھا۔

جینے کی ہمیں اور تمنا نہیں لیکن
مجبوریٔ حالات بھی اک سنگ گراں ہے

مجبوریٔ حالات کا یہ سنگِ گراں پندرہ سال تک اس کے اور میرے درمیان

اجنبیت کی دیوار بنا رہا۔ یوں کہنا چاہیے وہ شاعر مر گیا تھا جس نے لاہور میں کہا تھا۔

زلف بھی اس طرح نہیں بکھری
جس ادا سے بکھر گیا ہوں میں

اور آج حدیثِ غم کا آغاز لکھتے ہوئے میں خوش ہوں کہ وہ شاعر زندہ ہے جسے غمِ روزگار بھی شکست نہ دے سکا اور اب وہ کبھی نہ مر سکے گا۔ جو آج بھی حسن اور سچائی کا متلاشی ہے۔

قیسؔ چلتے ہیں کہ دیکھیں جا کر
کون پھولوں میں چھپا ہے ساقی

وہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کو ویرانی اُداسی اور فراق کی پرچھائیوں سے مضمحل دیکھتا ہے تو اُس کا شعور یہ تصویر دکھاتا ہے کہ

کیوں رنجشِ فراق سے گھبرا گیا ہوں میں
وہ بھی تو ہیں کہ جن کو غمِ روزگار ہے

سعید قیسؔ عشق کے فلسفہ کو حصولِ مقصد کی آخری منزل نہیں سمجھتا اور حصولِ مقصد میں ناکامی کو نامرادی تصور کرنے سے انکار کرتا ہے۔ جذبۂ عشق اور ''مرکزِ عشق'' کا تعین اس کی فکری جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اس کے ہاں ذوق وشوق کی فراوانی ہے اور عشق کے راستوں کی صعوبتوں کو جذبۂ عشق کا حاصل سمجھ کر اپنی قسمت پر نازاں ہے وہ فرار کو پسند نہیں کرتا۔ اس شعر میں اُس نے کتنے خوبصورت انداز میں اس کی دلیل پیش کی ہے۔

کیوں جائے مرے دل سے بھلا تیرا تصوّر
پھولوں کو کبھی چھوڑ کے نکہت نہیں جاتی

سعید قیسؔ بڑے بھرپور جذبے کا شاعر ہے۔ اظہار کو علامتوں کے ابہام سے

ملوث نہیں ہونے دیتا اور انتہائی سادگی اور فن کارانہ خلوص سے ابلاغ کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ یہی سعید قیسؔ کی نمایاں خصوصیت ہے اور ''حدیثِ غم'' انہی خصوصیات کا مرقع ہے اور مجھے یقین ہے کہ شعری ادب میں ''حدیثِ غم'' کو مخلصانہ پذیرائی حاصل ہوگی۔

یونس ادیب

دل سے نکلی جو آہ تو سمجھے
ہم نے اُن سے حدیثِ غم کہہ دی

دل میں اُٹھتے ہیں پریشان خیالوں کے ہجُوم
لذّتِ درد کا احساس گراں ہوتا ہے

منتظر ہیں درو دیوار نہ جانے کیوں آج
پھر ترے لَوٹ کے آنے کا گماں ہوتا ہے

ایک قطرے کے لئے ترسا کئے
ابر کھل کر جس گھڑی برسا کئے

ترک الفت سے ہوا جینا محال
تجھ کو کھو کر لاکھ غم پیدا کئے

آخرش پتھرا کے آنکھیں رہ گئیں
ہم انہیں کس شوق سے دیکھا کئے

اک تری چشم عنایت کے طفیل
دل پہ کیا کیا حادثے گذرا کئے

قیسؔ جس دم آپ کی یاد آگئی
رات کو ہم دیر تک رویا کئے

تیرے ہاتھوں میں شفا ہے ساقی
دل کا ہر زخم بھرا ہے ساقی

لوگ کیوں مے کو بُرا کہتے ہیں
اس میں کیا زہر ملا ہے ساقی

تیری سرشار نگاہی کے نثار
دل میں اک حشر بپا ہے ساقی

زندگی کیسے کٹی مجھ سے نہ پُوچھ
خون کا گھونٹ پیا ہے ساقی

دل کی اوقات ہی کیا ہے لیکن
اور اک طورؔ جلا ہے ساقی

نہ وہ شورش، نہ وہ مستی، نہ وہ کیف
ساز کیا ٹوٹ گیا ہے ساقی

مے کچھ اعجازِ مسیحا تو نہیں
دردکب دل سے گیا ہے ساقی

میرے ہمراہ مرے گھر کا چراغ
رات بھر جلتا رہا ہے ساقی

ہم سے سیکھے کوئی جینے کے طریق
ہم نے مر مر کے جیا ہے ساقی

اپنے قدموں میں پڑا رہنے دے
یہ جہاں کس کا ہوا ہے ساقی

شکوۂ جورِ یار ہی نہ رہا
دل میں کوئی غبار ہی نہ رہا

دولت کرب چھن گئی جب سے
زندگی کا وقار ہی نہ رہا

تیری چشم کرم کو کیا کہیے
دلِ منت گزار ہی نہ رہا

دل دھڑکتا ہے کیوں ہر آہٹ پر
جب ترا انتظار ہی نہ رہا

قیسؔ کس سے حدیثِ غم کہتے
جب کوئی غمگسار ہی نہ رہا رہا

ہر چند تغافل کی شکایت نہیں جاتی
اس دل سے مگر ان کی محبت نہیں جاتی

کیوں جائے مرے دل سے بھلا تیرا تصور
پھولوں کو کبھی چھوڑ کے نکہت نہیں جاتی

یہ ضُعف کا عالم ہے کہ دیکھا نہیں جاتا
آنکھوں سے مگر دید کی حسرت نہیں جاتی

ہے یاد ابھی تک وہ تری چشم عنایت
پہلو سے مرے درد کی لذّت نہیں جاتی

اے قیسؔ تصور کا یہ عالم ہے کہ مت پُوچھ
دل سے کسی صُورت تری صُورت نہیں جاتی

دیکھنے والے ذرا ربطِ محبت دیکھیں
مری بیتابی سے پہلے تری صُورت دیکھیں

جس کی رنگینی دامن پہ ہو گلچیں کی نظر
اہلِ گلشن ذرا اُس پُھول کی قسمت دیکھیں

آپ کی ذات سے جیسے کوئی نسبت ہی نہیں
اپنے دیوانے کا اظہارِ محبت دیکھیں

مری سرشار نگاہی کی شکایت ہے جنہیں!
وہ ذرا جا کے تری چشمِ عِنایت دیکھیں

شدتِ درد سے ہے قیسؔ پھر اک حشر بپا!
پھر مرے دل میں ہے اک شورِ قیامت دیکھیں

غمہائے روزگار کے گیسو سنوار دے
ساقی مجھے شراب کے دل میں اتار دے

جانے یہ کیا جنونِ محبت ہے اِن دنوں
جی چاہتا ہے کوئی مجھے تم پہ وار دے

اچھا نہیں مذاق نسیم سحر کہ یوں
غنچوں کے روبُرو تیرا آنچل اتار دے

خون جگر کرے تو کبھی خُونِ آرزو
غم کو تمہارے یوں نہ کوئی اختیار دے

حسرت ہی رہ گئی کہ کبھی نشترِ نگاہ
وہ شوخ مسکرا کے جگر میں اتار دے

اے قیسؔ ڈھونڈتا ہوں میں لیلائے زندگی
صحرائے نجد میں کوئی مجھ کو اُتار دے

وہ بھی رہتا ہے اب تمہارے ساتھ
دل جو مانوس تھا ہمارے ساتھ

اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تم بھی
عشق نے کیا کیا ہمارے ساتھ

زندگی ہے کہ شب کی پرچھائیں
نہ کوئی چاند نہ ستارے ساتھ

جب بھی آتی ہے اک خلش لے کر
یاد رکھتی ہے کیا شرارے ساتھ

پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئی
جو خوشی بھی گئی تمہارے ساتھ

قیسؔ غم کیا ہمیں مٹائے گا!
خود ہی مٹ جائے گا ہمارے ساتھ

جب سے نظر کو حسرتِ دیدارِ یار ہے
دل کی ہر ایک آرزو منت گزار ہے

حیران ہیں کمالِ فسونِ نظر پہ ہم!
کیونکر ہمارے دل پہ انہیں اختیار ہے

مجھ سے کرشمۂ سازئ سوزِ جگر نہ پوچھ
ان بیقراریوں میں بھی دل کو قرار ہے

کیوں رنجشِ فراق سے گھبرا گیا ہوں میں
وہ بھی تو ہیں کہ جن کو غمِ روزگار ہے!

اے قیسؔ اُس نگاہِ مروّت کو کیا کہیں
نشتر سا ہے کوئی کہ رگِ جاں کے پار ہے

غمِ وفا کا بھرم کھول کر نہیں آتے
تمہاری بزم سے باچشمِ تر نہیں آتے

میں جن کے واسطے ان پستیوں میں بھی خوش ہوں
بلندیوں سے وہ کیونکر اتر نہیں آتے

شکستِ عشق نے بھی حوصلہ بلند کیا
جگر گداز ہے آنسو مگر نہیں آتے

میں ذوقِ دید کی محرومیوں پہ روتا ہوں
وہ سامنے ہیں تو پھر کیوں نظر نہیں آتے

نہیں ہے قیسؔ اگر کوئی عفت جلوہ
جہاں میں اہلِ نظر بھی نظر نہیں آتے

فلک کو چاند ستاروں کو آگ لگ جائے
جہاں کے مست نظاروں کو آگ لگ جائے

فروغِ آتشِ گل سے چمن چمن یا رب
مری دعا ہے کہ خاروں کو آگ لگ جائے

جنوں کی آبلہ پائی وہ شعلے برسائے
خِرد کی راہگذاروں کو آگ لگ جائے

خدا کرے کہ کسی شعلۂ نگاہ سے قیسؔ
غمِ فراق کے تاروں کو آگ لگ جائے

اب میری زندگی ہے یہی لُطفِ خستگی
اچھا ہوا مجھے کوئی منزل نہیں ملی

اس زندگی سے اور تمنا کریں گے کیا
اک تیری آرزو تھی سو پوری نہ ہوسکی

یہ بھی بہت ہے اُن کا تغافل رہے بحال
ہم چشم التفات سے محرُوم ہی سہی

برسوں سے ہم ہیں عالمِ ہستی سے بے نیاز
یہ تیری یاد تھی جو بھلائی نہیں گئی!

کیا دل کا حشر ہوگا جو تو مل گیا ہمیں!
اس ڈر سے ساری عمر تری جستجو نہ کی!

رونے پہ جبکہ ختم ہوئی داستانِ عشق
پھر ہم نے مسکرا کے کوئی آرزو نہ کی

یہ کونسا مقامِ محبت ہے دوستو
آنکھوں میں شوق دل میں تمنا نہیں رہی

ہر موجِ نور قیس ہے گلشن میں بیقرار
سرشارِ عشقِ مہر ہے شبنم کی زندگی

……o……

یہ انتہائے مسرّت ارے معاذ اللہ
تجھے گلے سے لگایا تو آنکھ بھر آئی

……o……

ہر شورشِ دل باعثِ بیتابیٔ جاں ہے
ہر لحظہ ترے لوٹ کے آنے کا گماں ہے

کیوں دیکھتی ہے غور سے دُنیا مری صُورت
کیا تیری محبت مرے چہرے سے عیاں ہے

جینے کی ہمیں اور تمنا نہیں لیکن
مجبوریٔ حالات بھی اک سنگِ گراں ہے

شاید کوئی درمان کی صُورت نکل آئے
اے درد مجھے یہ تو بتا دے تُو کہاں ہے

دیتا ہے رگ جاں کو کوئی پیار سے جنبش
جیسے تری ہستی مری ہستی میں نہاں ہے

پھر جوشِ مسرّت سے یہ عالم ہے شبِ وصل
اک سیل محبت مری آنکھوں سے رواں ہے

اے قیسؔ انہیں عشق میں کیا خاک ملے گا
وہ جن کو محبت میں غم سودوزیاں ہے

کتنے زخموں کو ہوا دی لیکن
لذّتِ درد کی صورت نہ ہوئی

انقلاباتِ زمانہ مت پوچھ
اُن سے مِل کر بھی مسرّت نہ ہوئی

نہاں ہر پردۂ گل میں جمالِ روئے زیبا ہے
نگاہِ شوق نے تجھ کو ہر اک ذرّے میں دیکھا ہے

یہ میرا ذوقِ محرومی، یہ میرا شوقِ بے تابی
مرے دل کا مقدر ہے، ترے غم کا تقاضا ہے

پریشاں اہلِ محفل کیوں ہیں پروانے کے جلنے پر
وہی محرُوم ہے دُنیا سے جو دنیا کو سمجھا ہے

مری نظروں سے پنہاں بھی وہ میرے سامنے بھی ہیں
سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ جلوہ ہے کہ پردہ ہے

ہجومِ بے خودی میں یہ کھلا رازِ نہاں مجھ پر
اُسی کو مل گیا سب کچھ جو محرومِ تمنا ہے!

کسی کی یاد پھر ٹکرا رہی ہے ساحلِ دل سے
ہر اک موجِ نفس میں قیّمتِ اک طوفان برپا ہے

ارمانوں کے رنگ محل
اور کھڑے ہیں اک دو پل

یہ دل کی معصوم خُوشی
آہوں میں جائے گی ڈھل

ہم نہیں کرتے عہد وفا
کس سے بنے گا تاج محل

پلکوں سے تارے ٹوٹے
بھیگ گیا ان کا آنچل

پروانے کا جلنا کیا
ہم تو جلتے ہیں پل پل

قیسؔ پکاریں گے جب ہم
موت آئے گی سر کے بل

اب تو ہر سانس بہ اندازِ دگر آتی ہے
ڈوب جاتا ہے تو پھر دل کی خبر آتی ہے

دلِ مضطر ترا دیوانہ رہا ہے برسوں
اب تری یاد بھی مشکل سے ادھر آتی ہے

اپنی بربادی کا باعث ہمیں معلوم نہیں
لوگ کہتے ہیں یہ بات آپ کے سَر آتی ہے

ذوق نظارہ کی یہ کونسی منزل ہے جہاں
تری صورت مجھے ہر شئے میں نظر آتی ہے

دل میں جل اٹھتے ہیں اے قیسؔ محبت کے چراغ
غمِ فرقت سے کبھی آنکھ جو بھر آتی ہے

ماضی کو زندگی کا نہ مالک بنائیے
جو کچھ گزر گئی ہے اسے بھول جائیے

کہیے بس ایک بار کہ میرے لئے ہیں آپ
جھوٹی تسلّیوں سے مجھے پھر بنائیے

ہم کو نہیں ہے ضبطِ محبت میں کچھ کمال
آنکھوں میں سیلِ درد کو کیسے چھپائیے

یہ رنج و غم، یہ سوز ، یہ بے تابیٔ الم!
گر زندگی یہی ہے تو بس مسکرائیے

اے قیسؔ مجھ سے لذت درد و الم نہ پوچھ
جی چاہتا ہے اور بھی صدمے اٹھائیے

کچھ اس ادا سے کوئی آج مسکراتا ہے
غمِ حیات کا سایہ سمٹتا جاتا ہے

شعاعِ نور کبھی موجۂ صبا بن کر
یہ کون ہے جو مری جستجو میں آتا ہے

جہاں جہاں مری تقدیر کے اندھیرے ہیں
وہیں وہیں کوئی آ کر دیئے جلاتا ہے

کرشمہ سازِ تخیّل پہ جان دیتا ہوں
کہاں کہاں سے تمہیں جا کے ڈھونڈ لاتا ہے

دلِ تباہ کی محرومیاں نہ پوچھ مجھے
کہ ترا ذکر بھی اس داستان میں آتا ہے

شعاعِ مہرِ منوّر نے دی صدا مجھ کو
کہ حُسن عرصۂ عالم پہ یوں بھی چھاتا ہے

ہزار ترکِ تعلّق کے باوجود اے قیسؔ
کبھی کبھی مجھے ان کا خیال آتا ہے

کتنے زخموں کا جگر چاک ہوا
کس نے دُہرائی کہانی تیری!

مرنے کے اور ہی کرو ساماں مرے لئے
کافی نہیں ہے یہ غم ہجراں مرے لئے

اشک رواں لئے ہوئے آتی ہے اُن کی یاد
ہوتا ہے روزِ شب کو چراغاں مرے لئے

پھر دل میں حشر خیز ہے طوفانِ اضطراب
کیا آپ تو نہیں ہیں پریشاں مرے لئے

اے چارہ ساز زحمتِ چارہ گری نہ کر
ہر درد میں ہے درد کا درماں مرے لئے

اے قیسؔ ان سے تنگیٔ داماں کا کیا گلہ
عالم بصد وجود ہے زنداں مرے لئے

ہر چند ترا جلوہ بڑا شعبدہ گر تھا
جب غور سے دیکھا تو مرا ذوقِ نظر تھا

تم تھے رہِ منزل میں مرے ساتھ تو گویا
ہر ذرّہ مری راہ کا سرگرمِ سفر تھا

ہر لمحہ غم آتشِ محرومی تھا افزوں
گویا دلِ سوزاں مرے سینے میں شرر تھا

ہر زخم کو سینے میں جگہ دی ہے بصد شوق
لے دے کے مرے پاس یہی ایک ہنر تھا

ایسے بھی مقام آئے شب ہجر میں اے قیسؔ
فریاد میں تاثیر نہ آہوں میں اثر تھا

اے چمن زار میں رہنے والو
مرے دامن میں شرارے بھر دو
چھین لو مجھ سے مرا ذوقِ نظر
مرے احساس کو اندھا کر دو

پستیِ عالم مری منزل نہیں
یہ تری دُنیا مرے قابل نہیں

اَب ترے جلووں سے کیوں محروم ہوں
جب کوئی شے درمیاں حائل نہیں

شورشِ غم سے ہے ہنگامہ بپا
بزمِ ماتم ہے ہمارا دل نہیں

جب نظر میں ہے سرودِ عاشقی
پھر مری رگ رگ میں کیوں شامل نہیں

اے خوشا نیرنگیِ ذوقِ خیال
ہے کبھی محفل کبھی محفل نہیں!

اب ذرا آیا ہے لطفِ زندگی
موجِ طوُفاں میں کوئی ساحل نہیں

قیسؔ دستِ دل ہے خود عقدہ کُشا
کوئی مشکل بھی مری مشکل نہیں

ترے بغیر بھی ہم نے گزار دی اے دوست
یہ زندگی جو ترے نام سے عبارت تھی

ہر خرابات میں زہر آب پیا ہے میں نے
جینا مشکل ہے مگر جی ہی لیا ہے میں نے

اپنی بربادی کا جب بھی مجھے آیا ہے خیال
دلِ ناداں کو بہت یاد کیا ہے میں نے

چاکِ ہستی میں رفو کی کہاں گنجائش تھی
ورنہ ہر زخمِ محبت کو سیا ہے میں نے

تیرا اس دَور میں ملنا کوئی آساں تو نہ تھا
پھر بھی اے دوست تجھے ڈھونڈھ لیا ہے میں نے

ہر غزل میری غمِ سوزشِ دل ہے اے قیسؔ
اپنے ہر شعر کو کچھ خون دیا ہے میں نے

بے تابیِ احساس کا عالم بھی رہے گا
جب دل ہے تو پھر اس میں ترا غم بھی رہے گا

آنکھیں ہیں تو پھر حسرتِ دیدار بھی ہوگی
ہر زخمِ نظر صورتِ مرہم بھی رہے گا

گر شوقِ گرفتاریٔ عشاق ہے باقی
آنکھوں میں فسوں زلفوں میں یہ خم بھی رہے گا

اے مہر تری کوشش بے کار کا غم ہے
گلشن ہے تو پھر گریۂ شبنم بھی رہے گا

اے قیسؔ یہ مانا وہ مرے ہو نہیں سکتے
جب مرگِ تمنا ہے تو ماتم بھی رہے گا

اُداس شب کی طویل تنہائیاں سنائیں گی جب کہانی
ترے خیالوں کی چاندنی سے لپٹ کے سوجائیگی جوانی

تمہاری زُلفوں کی دُھوپ چھاؤں میں ہم کو جتنا قرار آیا
اُسی قدر آج دل پہ نازل ہوا ہے اک قہرِ آسمانی!

سُلگ رہے ہیں مرے تصوّر میں قُربتوں کے حسین لمحے
تمہاری ہر سانس کے لمس میں تھی جیسے دریاؤں کی روانی

تمہارا غم ہے تو دل میں کچھ سوز، آنکھ میں کچھ نمی ہے باقی
وگرنہ ہم جس مقام پر تھے وہاں نہ یہ آگ تھی نہ پانی

کسی کے جانے سے قیسؔ دِل پر نہ جانے کیسا اثر ہوا ہے
لہُو کی صُورت چھلک رہی ہے سبو سے صہبائے ارغوانی

وہ جن کے آستاں پہ جھکا آسماں رہے
اُن کی نظر میں پھر کوئی ہم سا کہاں رہے

مثلِ غبارِ راہ رہے اُن کے ساتھ ہم
یہ اور بات ہے کہ پسِ کارواں رہے

اتنا پتہ ہے اُن کی نظر لے اڑی ہمیں
پھر اُس کے بعد کس کو خبر ہم کہاں رہے

ہر روز دل میں اک نیا محشر بپا رہا
جب تک تری نظر کے تقاضے جواں رہے

اُن سے جُدا ہوئے نہ کبھی مل سکے اُنہیں
حدِ وصال و ہجر کے ہم درمیاں رہے

اے قیسؔ اُن کی یاد کا عالم نہ پوچھئے
شب بھر ہماری آنکھ سے آنسو رواں رہے

اپنی بانہوں میں پھر پنہ دیدے!
وقت سے مات کھا گیا ہوں میں

زیست کی تلخیوں سے گھبرا کر
پھر ترے پاس آ گیا ہوں میں

غم کے ہاتھوں سنور گیا ہوں میں
صورتِ گُل نکھر گیا ہوں میں

تُو نگاہوں کے آس پاس رہا
تیرے صدقے جدھر گیا ہوں میں

زُلف بھی اس طرح نہیں بکھری
جس ادا سے بکھر گیا ہوں میں

غمِ ماضی کو کون دے آواز
سر جھکائے گذر گیا ہوں میں

پھر بہاریں پُکارتی ہیں مجھے
مجھ کو ڈھونڈو کِدھر گیا ہوں میں

گِر کے تیری حسیں نگاہوں سے
اپنے دل سے اُتر گیا ہوں میں

وہ سمجھتے ہیں قیسؔ زندہ ہے
مجھ سے پوچھو تو مر گیا ہوں میں

یقین ہے کہ یہاں اب نہ کوئی آئے گا
نہ جانے پھر مری آنکھوں کو انتظار ہے کیا

بے تابیِ حیات کا مظہر کہیں جسے
وہ دِل ملا ہے درد کا خُوگر کہیں جسے

آسودگیِ دل میں کہاں لطفِ زندگی
اُس شے کی آرزو ہے کہ نشتر کہیں جسے

اے حُسنِ شعلہ بار ذرا سامنے تو آ
میں وہ نہیں ہوں، لوگ پیمبر کہیں جسے

کافر ہے جس کو مرگِ طبیعی سے ہو گلہ
مارا ہے اُس نے اپنا مقدّر کہیں جسے

کافی ہے قیسؔ زینتِ ہستی کے واسطے
وہ ایک داغِ عشق گُلِ تر کہیں جسے

تیرا دیوانہ ہوگیا ہوں میں
اپنے بس میں نہیں رہا ہوں میں

انتہائے نظر نہیں معلوم
وہ مجھے، اُن کو دیکھتا ہوں میں

جب سے بستی بسا کے بیٹھا ہوں
کچھ نہ پوچھو اُجڑ گیا ہوں میں

لطفِ سوزِ نہاں معاذ اللہ
اپنے زخموں کو چومتا ہوں میں

آرزوئے خراب ہوں اے قیسؔ
اپنے دل ہی رہ گیا ہوں میں

غمِ حیات کو ہم نے بہت سنوارا ہے
ہر ایک لمحہ تری یاد میں گزارا ہے

ہزار بار مری بے کسی دل نے تجھے
حصُولِ غم کے بہانے سے بھی پکارا ہے

شبِ فراق مجھے گر یہی سکون مِلے
تمام شب یونہی جلنا مجھے گوارا ہے

حیات وموت حقیقت میں کچھ نہیں اے دوست!
تری نگاہ کا ہلکا سا اِک اشارہ ہے

مری نگاہ سے اُلجھی ہے بار بار آ کر
وہ زلف تُو نے جسے پیار سے سنوارا ہے

ہر ایک زخمِ جگر پھول بن گیا اے قیسؔ
کِسی کی یاد کو پہلوُ سے یوں گزارا ہے

یُوں بظاہر مرے ہر غم سے پریشاں ہونا
جیسے آتا ہے اُنہیں درد کا درماں ہونا

آنکھ کو ناز ہے اشکوں کی روانی پہ اگر
دل نے سیکھا ہے ترے درد پہ قرباں ہونا

ہم نے دیکھا ہے فرشتوں کی عبادت کا مآل
ہم نہ چاہیں کبھی انسان کا رضواں ہونا

ہمہ تن دید بنا ہوں تو کھلا ہے مجھ پر
تیرے جلوے کی ادا ہے ترا پنہاں ہونا

جس کو تھامے ہے محبت سے ترا دستِ کرم
میری قسمت میں کہاں غیر کا داماں ہونا

کیوں پریشان ہو تم میری پریشانی سے
میری تقدیر میں لکھا ہے پریشاں ہونا!

اُس بُتِ گل کی پرستش ہے مرا مذہبِ کل
قیسؔ منظور نہیں مجھ کو مسلماں ہونا

ڈھلتے ڈھلتے غمِ حالات میں ڈھل جائیں گے
دل کے ارمان کھلونوں سے بہل جائیں گے

آپ کو عذر ہے کیا جلوہ نُما ہونے میں
ہم کوئی طوُر نہیں، دیکھ کے جل جائیں گے

رونقِ بزم سدا یوُنہی رہے گی قائم
ایک ہم ہی تری محفل سے نکل جائیں گے

حشر تک تیرے تعاقب میں رہیں گے اے دوست
سایۂ ابر نہیں کوئی کہ ڈھل جائیں گے

قیسؔ کچھ جھوٹ نہیں وعدۂ اُلفت اپنا
ہم مقدّر تو نہیں ہیں کہ بدل جائیں گے

نہ کی شکایتِ آزار زندگی جس نے!
وہی جیا ہے خوشی سے گزار دی جس نے

شگفتِ گل مری پژمردگی کو کیا سمجھے
چمن چمن میں اڑائی مِری ہنسی جس نے

تِری نگاہ کا احسان مند ہوں اے دوست
سکھا دیئے مجھے آدابِ عاشقی جس نے

میں رازدان سمجھتا تھا عندلیب اُس کو
کلی کلی سے مری داستاں کہی جس نے

وُہی بتائے گا اب رازِ دوریٔ منزل
دیا ہے قیسؔ مجھے لطفِ خستگی جس نے

نہ بے وفائی کے شکوے، نہ بے کسی کے گِلے
جہاں میں کِس کو مِلے ہیں محبتوں کے صِلے

چمن میں پھر نہ ہوئی عندلیب نغمہ سرا
تمہارے بعد اگرچہ ہزار پھوؔل کِھلے

شبِ فراق نہ جانے یہ کیسا عالم تھا
دُعا کو ہاتھ ہی اُٹھے نہ میرے لب ہی ہلے

ہمیں خود اپنی نظر پر نہ اعتبار آیا
وُہ آج ہم کو بڑی مدتوں کے بعد ملے

جنوؔں میں قیسؔ رہا کِس کو پاسِ رسوائی
ہمارے چاکِ گریباں سِلے سِلے نہ سِلے

رُخِ زیبا ہے ترا یہ مہِ تاباں مجھ کو
عشرتِ ذوقِ نظارا ہے فراواں مجھ کو

شعلۂ رنگِ گلستاں میں ہے جلوہ آرا
عارضِ گل سے ملی سوزشِ پنہاں مجھ کو

موجۂ نُور ہو یا پردۂ انوارِ سحر
تیری صورت نظر آتی ہے نمایاں مجھ کو

عشق نے بخشی ہے وہ دولتِ عرفاں کہ نہ پوچھ
حسن سمجھا ہے مگر بے سر و ساماں مجھ کو

یہ ترا نقشِ کفِ پا یہ مرا ذوقِ سجود
منزلِ کفر پہ لے آیا ہے ایماں مجھ کو

وسعتِ ظرفِ نظر بارِ نظر ہے اے قیسؔ
ایک اِک ذرّۂ صحرا ہے بیاباں مجھ کو

شورشِ زیست سے محروم ہوں اب
کاش ساحل پہ بھی طوفاں ہوتے

مری نظر کو کہیں آگ ہی نہ لگ جائے
سُلگ رہا ہے ترا انتظار آنکھوں میں

عظمتِ زندگی کو کیا کہیے
تیرے پاؤں کی دُھول بھی تو نہیں

بکھر گئے ہیں مری راحتوں کے شیرازے
مری حیات کا دامن سنوار دے پہلے
شراب کی مجھے اتنی طلب نہیں ساقی!
نگاہ میرے جگر میں اتار دے پہلے

جب سے رہے ہیں اُس بُتِ نامہرباں کے ساتھ
اپنے خدا کے ساتھ نہ تھے ہم جہاں کے ساتھ

مجھ کو بھی اب شکست محبت کا ہے گماں
کچھ تلخیِ الم بھی ہے شامل فغاں کے ساتھ

اہلِ جہاں نہ مجھ کو فراموش کر سکے
میرے بھی تذکرے ہیں تری داستاں کے ساتھ

تُو کہکشاں میں ہم کو رہا ڈھونڈتا مگر
ہم گردِ کارواں تھے ترے کارواں کے ساتھ

اے قیسؔ اعتبارِ وفا کھو چکے ہیں ہم
کیوں کر کوئی نباہ کرے بدگماں کے ساتھ

رنج تھا یا خوشی نہیں معلوم!
عمر کیسے کٹی نہیں معلوم

اُس نے دیکھا تھا پھول کا انجام
پھر کلی کیوں کھِلی نہیں معلوم

منزلِ دل سے آج پھر ہم کو
کِس نے آواز دی نہیں معلوم

وہ تغافل کی اک نگاہ مجھے
جانے کب لے اُڑی نہیں معلوم

جل گیا ایک پل میں پروانہ
شمع کب تک جلی نہیں معلوم

ہم نے کِس بات پر اُنہیں چاہا
ہم کو وہ بات ہی نہیں مُعلوم

قیسؔ پردہ تو رُخ سے اُٹھا تھا
کِس پہ بجلی گری نہیں معلوم

قطرۂ خون جس کو دل کہیے
اک خرابہ ہے آرزوؤں کا

جب صبا زُلفِ پریشاں کی خبر لاتی ہے
شدّتِ غم سے مری جان پہ بن آتی ہے

اشک آنکھوں میں اُمنڈتے ہیں تو پی جاتا ہوں
مَوج آ آ کے کنارے سے پلٹ جاتی ہے

تیری صورت بھلا جی بھر کے کوئی کیا دیکھے
آنکھ اُٹھاتے ہیں تو وہ دل میں اُتر جاتی ہے

ہر نفس میں تری سانسوں کی مہک ملتی ہے
ہر قدم پر ترے قدموں کی صدا آتی ہے

قیؔس پیری میں اگرچہ مجھے چلنا ہے محال
جستجو جانے کہاں کھینچے لئے جاتی ہے

پردۂ گل میں جمالِ رُوئے زیبا دیکھئے
دیدۂ حیراں سے ہر پردے میں جلوہ دیکھئے

حسرتِ دیدار بھی باقی ہے شوق دِید بھی
دِل ہجوم آرزو میں بھی ہے تنہا دیکھئے

جو مری نظروں سے پنہاں پردہ حیرت میں ہے
میری رگ رگ میں اُسی کو جلوہ فرما دیکھئے

کس نے کی ہے آج تک کیفیت فرقت بیاں
میری بے تابی کا خود آکر تماشا دیکھیے

قیسؔ اتنی دُوریوں پر بھی ہیں وہ کتنے قریب
دِل کے آئینہ میں، اُن کا رُوئے زیبا دیکھئے

تجھ سے ملنے کی خوشی تجھ سے بچھڑنے کا ملال
تیری یادوں سے ہے لبریز مرا ظرفِ خیال

اَب یہ عالم ہے کہ وہ چشمِ عنایت بھی نہیں
تُم تو کہتے تھے محبت کو نہیں کوئی زوال

نہ کسی یاد کی آہٹ، نہ کسی غم کی صدا
ایک مدّت سے ہے ویران گذرگاہِ خیال

گریۂ غم نے کیا اور بھی رُسوا مجھ کو
کہ مرے دل کو نہیں ضبطِ محبت میں کمال

ایسا عالم ہے کہ جیسے کوئی عالم ہی نہیں
نہ مِرا دیدۂ حیراں، نہ کہیں تیرا جمال!

زندگی شدّتِ احساسِ کرم ہے اے قیسؔ
ہمہ تن ذوقِ تصوّر، ہمہ تن موجِ خیال

زندگی اِک عذاب تھی لیکن
پھر بھی جینے سے ہم نہ باز آئے

کتنا بے تاب کیا دید کی حسرت نے مجھے
تا دمِ زیست نہ چھوڑا غمِ فرقت نے مجھے

تیری یادوں سے جُدا، تیرے خیالوں سے بلند
اک نئی فِکر عطا کی ہے محبت نے مجھے

اور آئیں گے ابھی یاد وہ ایامِ شباب
کھو دیا کیسے بس اک لحظہ کی فرصت نے مجھے

دل سے جاتا ہی نہیں تیری محبت کا خیال
مار ڈالا ہے تری چشمِ عنایت نے مجھے

اتنا مانُوس ہوں ہنگامۂ غم سے کہ نہ پُوچھ
کچھ پریشاں نہ کیا شورِ قیامت نے مجھے

قیسؔ کچھ وحشتِ بیکار نہیں ہے مجھ کو
طالبِ درد کیا درد کی لذّت نے مجھے

کیا اسی طرح بگڑتے مجھ سے
آپ گر میرا مقدّر ہوتے

زہے قسمت ترا سلام آیا
جذبۂ عشق میرے کام آیا

ہم سَرِدار تھے مقدّر سے
ترے آنے کا جب پیام آیا

سی دیئے مفلسی نے لب میرے
جب زباں پر تمہارا نام آیا

سخت مشکل میں اے دلِ ناکام
جُز ترے کون تھا جو کام آیا

قیسؔ ہم اُن کو بھی نہ پہچانے
عشق میں یہ بھی اِک مقام آیا

وہ بھی اب چھپ کے مجھے روزنِ در سے دیکھیں
لیجئے پانی گزرتا ہوا سَر سے دیکھیں

شعلۂ رنگ میں تم، نغمۂ گُریز میں تم
دیکھنے والے تُمہیں میری نظر سے دیکھیں

قہقہے سارے زمانے کے تصدّق کر دوں
شرط یہ ہے وہ مجھے دیدۂ تر سے دیکھیں

اک ترے پرتوِ رنگیں کے سوا کچھ بھی نہیں
آئنہ اہلِ نظر چاہے جدھر سے دیکھیں

غمِ امروز ہے پیغامِ مسرّت اے قیسؔ
شب کے انجام کو آغازِ سحَر سے دیکھیں

مِٹا کے چھوڑ گئی راحتیں مرے دل کی
وہ اِک خلِش جو مِری زندگی کا حاصل تھی

چراغ لے کے اُنہیں آج ڈھونڈتا ہوں میں
وہ دن کہ تم بھی مرے ساتھ ہمسفر تھے کبھی

تمہارے غم کے تصدق جو دل کو سونپ گیا
بُجھی بُجھی سی تمنا، لُٹی لُٹی سی خوشی

ہزار بار یہ چاہا بھُلا ہی دیں تجھ کو
دل و دماغ کے مابین کشمکش ہی رہی

بس اک وہ شدّتِ احساس ہی نہیں ورنہ
ہمارا دل بھی وہی ہے تمہارا غم بھی وہی

جئے ضرور مگر قیسؔ زندگی ہم نے
کچھ اس طرح سے گزاری کہ کام کی نہ رہی

ہمارا حال اگر دیکھتے تو رو دیتے
یہ اور بات کہ اب سامنے نہیں ہو تم

مری ویرانیِ دل بھی اے دل رونق سے کیا کم ہے
اِدھر ماتم پہ خوشیاں ہیں، اُدھر خوشیوں کا ماتم ہے

مہ و خورشید میں، ذرّوں میں، پھُولوں میں، ستاروں میں
تمہی کو ڈھونڈتی رہتی ہیں آنکھوں کا یہ عالم ہے

تری چشمِ عنایت نے بڑا اِحساں کیا مجھ پر
محبت کا یہ اک لمحہ مجھے کِس بات سے کم ہے

شعاعِ مہر کی کوشش کو کیوں نہ رائیگاں کہئے
چمن کے واسطے روئے یہی تقدیرِ شبنم ہے

انہیں ہے خوف تنہائی یہاں آنکھوں میں آنسو ہیں
شبِ ہجراں کا یہ عالم نہ جانے کیسا عالم ہے

وہ خود کھنچتے چلے آتے ہیں اور میں محوِ حیرت ہوں
نہ جانے قیس اب دُنیا میں اپنی زندگی کم ہے

کبھی تڑپے، کبھی روئے، کبھی بے تاب ہوئے
تجھ کو کھویا تو بہت رنج اُٹھائے ہم نے

گرچہ اسیرِ رنج واَلم سر بسر ہوں میں
پھر بھی رہو زِغم سے ابھی بے خبر ہوں میں

پھر شوخیٔ نگاہ مجھے لے کے اُڑ گئی
سب مجھ کو ڈھونڈتے ہیں بتاؤ کدھر ہوں میں

جلوہ ترا، خیال ترا، آرزو تری
تُجھ سے جُدا ہوں پھر بھی ترا ہمسفر ہوں میں

روتا ہوں آپ، آپ ہی کرتا ہوں اُن کو یاد
اپنی رگِ حیات پہ خودنیشتر ہوں میں

بیٹھا ہوا ہوں دیدۂ و دل فرشِ راہ کیے
اے دوست مدّتوں سے سرِ رہگذر ہوں میں

ہر موجۂ ہوا سے ہے لرزاں مقامِ زیست
اے قیسؔ مشتِ خاک سے کیا بیشتر ہوں میں

یہ اُن سے پوچھ کہ اعجازِ ضبطِ غم کیا ہے
وہ جن کو اب ترے آنے کا انتظار نہیں

ہجر کا غم نہیں دیکھا جاتا
دِل کا ماتم نہیں دیکھا جاتا

مرگِ پَروانہ کہاں تک دیکھیں
اَب یہ عالم نہیں دیکھا جاتا

آنکھ سے دل میں اُتر جاتے ہیں
اُن کو پیہم نہیں دیکھا جاتا

میری آنکھیں تِری آنکھوں کے نثار
جن کو برہم نہیں دیکھا جاتا

قیسؔ اپنی تو کوئی بات نہیں
غیر کا غم نہیں دیکھا جاتا

آپ کے غم کو کئی نام دیئے
عشق میں ہم نے بہُت کام کیے

ہوشمندوں سے یہ پوُچھے کوئی
ہم نے کب چاکِ گریباں نہ سیے

کون غیروں سے شکایت کرتا!
ہم کو اپنوں نے بھی الزام دیئے

ترکِ اُلفت کی قسم کھاتے ہیں
ہم ترے بعد خوشی سے نہ جیے

قیس ہنگامِ جنوں میں اکثر
ہم نے اُس بُت کے قدم چوم لئے

برسوں سے داغِ عشق چھپایا ہوا تو ہے
ہم نے چراغِ طور جلایا ہوا تو ہے

وہ روگ جس کا نام محبت ہے دوستو
ہم نے وہ روگ دل کو لگایا ہوا تو ہے

اپنی نظر کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم
اُس نے نقاب رُخ سے اُٹھایا ہوا تو ہے

یہ داغِ عشق جس پہ گلستاں نثار ہوں
یہ گل تری نظر کا کھلایا ہوا تو ہے!

اے قیسؔ دل میں غم ہے تو آنکھوں میں اشکِ غم
سرمایۂ حیات بچایا ہوا تو ہے

کچھ جذبِ محبت بھی مرے کام نہ آیا
موت آگئی لیکن ترا پیغام نہ آیا

مارا غمِ ہجراں نے مجھے دُور وطن سے
اچھا ہوا تم پر کوئی الزام نہ آیا!

کہنے کو تو سب مونس و غم خوار تھے لیکن
جب آئی مصیبت تو کوئی کام نہ آیا

یوں محوِ غم گردشِ ایام رہے ہم
بھولے سے کبھی لب پہ ترا نام نہ آیا

گو کوششِ درماں تو مسیحا نے بہت کی
اے قیسؔ مگر درد کو آرام نہ آیا

اُن سے ملنے کی آرزو کی ہے
زندگی کو بڑی سزا دی ہے

ان کا غم بھی نہیں رہا باقی
کب سے جیب حیات خالی ہے

ہم سزاوارِ عشق ہی تو نہیں
تیری آنکھوں کی کچھ خطا بھی ہے

لُطفِ قربت وہی بتائیں گے!
جن کے شانوں پہ زلف بکھری ہے

جُز ترے کچھ نظر نہیں آتا
یُوں محبت نے روشنی کی ہے

قیسؔ کِس کِس کو دیکھئے کہ یہاں
جو بھی صُورت ہے آپ کی سی ہے

سعید قیس کی غزلیں غم ہستی کی آئینہ دار ہیں اور اُس کا اولین مجموعہ کلام ''حدیث غم'' ایک کامیاب تخلیق ہے۔

(منیر نیازی)

سعید قیس کی شاعری خالص ادبی شاعری ہے اور صاف ستھری زبان میں شعر کہنا قیسؔ کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔

(حافظ امرتسری)

سعید قیس دیارِ غزل کا سجیلا شہریار ہے جس کی شاعری شبنم کے وضو اور شعلوں کی حرارت سے عبارت ہے۔

(قمر صدیقی)

سعید قیسؔ کے فکری سوتے روایت سے پھوٹے ہیں پھر بھی کہیں کہیں اس دھارے میں رجائیت کا رنگ ایک نئی صورت گری کا باعث بنا ہے قیس کے شعر میں سادگی اور بھرپور خلوص نمایاں ہے۔

(حسن بخت)

ہجر کے موسم

سعید قیس

اہل قلم کی رائے

فہرست

○

جوش ملیح آبادی

چار پانچ برس پیشتر راغبؔ صاحب کے دفتر میں سعید قیسؔ صاحب سے متعارف ہوا تھا۔ راغبؔ صاحب نے تعارفی کلمات میں یہ کہا کہ سعید قیسؔ سالہا سال سے بحرین میں بہ سلسلۂ معاش اقامت پذیر ہیں اور غزال بہت اچھی کہتے ہیں تو مجھے ایک تاسف آمیز حیرت ہوئی۔ اس لئے کہ اس دور میں بھی بیشتر غزل گوشعراء روایتی غزل ہی کی زلفوں کے اسیر ہیں۔ لیکن جب انہوں نے دو تین غزلیں سنائیں تو مجھے اپنی رائے میں ترمیم کرنا پڑی۔ سعید قیسؔ کی غزلوں میں ایک تھیم، ایک تسلسل اور ایک کیفیت دل پذیر پائی جاتی ہے۔ ایسی غزلیہ شاعری اُردو زبان کے شعری سرمائے میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

سعید قیسؔ کا دوسرا مجموعہ کلام بازارِ ناپُرساں میں آرہا ہے دیکھئے اہلِ نظر اس کی داد کس حد تک دیتے ہیں۔

عبرت بگیر از من و کسب ہنر مکن
از بہر خود، عداوتِ ہفت آسماں مخواہ

سعید قیسؔ اورؔ ہجر کے موسم

''ہجر کے موسم'' نام ہے سعید قیسؔ کی غزلیات کے مجموعہ کا جو اُن کے کلام کا دُوسرا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعۂ غزلیات آج سے کوئی بارہ سال پہلے شائع ہوا تھا۔ سعید قیسؔ کا مولد لاہور ہے اور وہ نسباً کاشمیری ہیں۔ سعید قیسؔ اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے غزل کے شاعر ہیں جیسے جغرافیائی اعتبار سے خطِ استوا کا ماحول دوزخ درآغوش اور فطرت سوز ہے۔ ویسے ہی فطرتاً کشمیر جنت نظیر کا ماحول وہاں کی روز بروز بدلتے رہنے والی سیاسی فضا سے قطع نظر ایک ایسا ماحول ہے۔ جس کو رنگارنگ بہاروں کا گہوارہ کہنا چاہیے یہاں فطرت کا جمال انگڑائیاں لیتا ہے۔ اور یہ مست گھٹائیں اپنے بھیگے گیسو نچوڑتی ہیں۔ اگرچہ ہر شاعر کی شخصیت کے ترکیبی عناصر نسلی، نسبی، جغرافی، تربیتی سماجی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے کئی ہوتے ہیں لیکن ان عناصر ترکیبی میں شاعر کو داخلی اعتبار سے اور اس کے ماحول کو خارجی اعتبار سے بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ سعید قیسؔ کو نسبی اور ماحولی اعتبار سے فطرتاً ایک غزل گو شاعر ہونا چاہیے۔ وہ ایک غزل گو شاعر ہیں اور ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۵۰ء سے ہوتا ہے ظاہر ہے یہ وہ دور ہے جب ہندوستان کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے لیکن سعید قیسؔ کی شاعری کا یہ وصف سب سے زیادہ قابل قدر ہے کہ وہ تقسیم ہند کے بعد سے ایسی غزل کہتے رہے۔ جس کے چہرے پر انقلاب کا خون نظر آتا ہے مگر جس کے فطری جمال میں کوئی فرق نہیں

ہوتا۔ سعید قیسؔ صرف از خود رفتہ قسم کے شاعر ہی نہیں، بلکہ ان استعاروں اور کنایات میں وہ اشارے بھی جگہ جگہ ملتے ہیں جن کو عرفِ عام میں حالات کی شکست و ریخت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس شاعر کی شاعری کا تمام تر شعور اس کو اپنی ہی اَنا کے خول میں بند کر دیتا ہے وہ شاعر سماج اور انسانیت کا شاعر نہیں ہوتا بلکہ اس کے اعصاب پر عورت کچھ اس طرح سوار ہو جاتی ہے کہ اس کو زندگی کی پہلو داری کا کوئی شعور نہیں ہوتا۔ سعید قیسؔ اس لحاظ سے بڑے باضمیر اور کھرے غزل گو ہیں کہ جہاں وہ حُسن و عشق کے کیف وکم میں خُود رفتہ نظر آتے ہیں۔ وہیں اتنے چوکنا اور ہوشیار بھی ہیں کہ اُن کی نظر کی گہرائی میں حالات کا انتشار اور وقت تحولات میں بھی سمٹ آتے ہیں۔ ان شاعری کی قدریں، اخلاقی بھی ہیں جمالی بھی اور تعمیری بھی لیکن ان کے فن کے یہ سارے پہلو تحت الشعوری زیادہ ہیں۔ شعوری کم اور سچ پوچھئے تو فطری شاعری یہی ہوتا ہے۔

دیکھا تو ایک ربط تھا ہر شے کے درمیان
سوچا تو زندگی میں بڑا اِنتشار تھا

ترکِ اُلفت بھی اِک ضرورت تھی
ہم نے سوچا تو ہم بہت روئے

ابر برسا بھی تو دریاؤں پہ جا کر برسا
مُنہ کھلے رہ گئے تپتے ہوئے صحراؤں کے

یہ ہے سعید قیسؔ کے فِکر ونظر کی وہ گیرائی اور پہنائی جس شاعر کا فنی شعور جہاں اپنے کرب کو محسوس کرتا ہے، وہاں اُس اِنسانیت کے ساتھ بھی سچائی برتتا ہے جو تاریخ کے جلال اور جمال کی اکائی ہے۔ جناب سعید قیسؔ کے کلام میں نفسیاتی اور سماجی

سچائیاں جھلکتی ہیں، اُن کے اظہار میں سعید قیسؔ جس سادگی اور لب و لہجے کی نرمی سے کام لیتے ہیں۔ اسی ٹیکنیک میں اُن کے فن کا تاثر مضمر ہے۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اُن کے محسوسات کی داخلی اور خارجی صداقت اور پیرایۂ اظہار کی شائستگی سے اُن کا فن ایک دو آتشہ شراب بن جاتا ہے۔ جس کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو صرف رند ہی نہیں بلکہ عالی ظرف بھی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ''ہجر کے موسم'' کو غائر نظر سے دیکھنے کے بعد اہلِ نظر سعید قیسؔ کے فنی شعور کی صحت کا بخوبی اندازہ لگا سکیں گے۔ اور یہ مجموعۂ شعری ملک میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

پروفیسر منظور حسین شورؔ

۱۵ فروری ۱۹۸۰ء

پیشینہ

اُردو شاعری کی ابتداء بھی غزل سے ہوتی ہے۔ انتہا بھی اس ابتداء اور انتہا کے درمیان فکر و نظر اور جذبہ و تخئیل کی لامحدود وسعتیں ہیں اور ہر غزل گو اپنی استعداد کے مطابق اس وسعتِ تخیل میں اپنی تنگ نائے غزل آپ تخلیق کرتا ہے۔ جناب سعید قیّس کا مجموعہ کلام ''ہجر کے موسم'' ان کی اِنفرادیت کا نِشان اور مخصوص اندازِ فکر کا ترجمان ہے۔ غزل سرائی جس قدر آسان ہے اس قدر مشکل بھی ہے۔ شاعر کی باطنی واردات جس قدر پیچیدہ، مرکب اور عمیق ہوں گی۔ اس کی غزل میں اتنی ہی گہرائی، ڈرامائیت اور انوکھاپن ہوگا۔ لیکن ان کی شاعری سے قبل ان کی شخصیت کا تعارف ضروری ہے۔ اسم گرامی ہے۔ محمد سعید قیّس، والد ماجد کا اسم گرامی حاجی معراج الدین، کاشمیری نژاد ہیں اور اُن کی شخصیت میں وہی دلآویزی، رعنائی اور شگفتگی پائی جاتی ہے جو چمن زار کشمیر سے تعلق رکھنے والوں کی خصوصیت ہے۔ ۲۸ مئی ۱۹۲۷ء کو موچی دروازہ لاہور کے محلہ سادھواں میں پیدا ہوئے۔ ایف اے تک تعلیم پائی۔ ذوقِ سخن خُداداد تھا۔ بچپن ہی میں طبعِ حساس پر موسیقی اور شاعری کی آہنگ سے وجد وحال کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ آخر کیفیت نے اپنے اظہار کا تخلیقی راستہ ڈھونڈ نکالا اور سعید قیّس نے ۱۹۵۰ء سے باقاعدہ شاعری شروع کردی۔ پہلا مجموعہ بارہ سال قبل حدیثِ غم کے نام سے شائع ہوا۔ سعید صاحب تقریباً تیس سال سے بیرونِ ملک (پہلے سعودی عرب پھر بحرین) اعلیٰ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ تاہم ذوقِ

شعری میں وہی حرارت اور طبعِ رسا میں وہی جولانی ہے۔ جو لاہور کی ادبی صحبتوں میں پروان چڑھ سکتی ہے۔ ''ہجر کے موسم'' کی ورق گردانی سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر کی زبان کس قدر سلیس اور اندازِ بیان کس درجہ نفیس ہے۔ ابہام سے پاک اہمال سے بَری اور تعقید و تقید سے منزہ ہے۔

دیکھ کے پھول کی ڈالی ہم نے
تیری تصویر بنالی ہم نے

مضمون برجستہ، قریب الفہم اور اہتزاز بخش ہے۔

لے گئی گردشِ دوراں سب کچھ
اِک تری یاد بچالی ہم نے

دردؔ کی آبادی کے لئے خانۂ دل کی تعمیر بڑی عجیب تعبیر و تعریف ہے۔

جل اُٹھا میں چراغِ شب کی طرح
آج کی شام کچھ ڈھلی ایسی
جُز ترے کچھ نظر نہیں آتا
کِس کے گھر میں ہے روشنی ایسی

یہ تصوّرات سب ایک ہی سلسلۂ واردات کی کڑیاں ہیں۔ جن کی پیوستگی سے تغزل کا دِل آویز مضمون پیدا ہوا ہے۔ سعید قیسؔ میں غنائیت اور لہجے کی موسیقی فراوانی کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ رواں دِلکش بحروں میں کہتے ہیں۔ اور خوب کہتے ہیں۔

رات جاگا ہوں تو سوچا کیا ہے
اب مری سوچ میں رکھا کیا ہے
اِس محبّت کے تقاضے کیا ہیں
یہ ہمیشہ کا بچھڑنا کیا ہے

شاعر کو الفاظ تراکیب اور اسالیب بیان پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ کیا مجال کہ کسی مصرع میں جھول اور کسی پیرایۂ اظہار سے جھجک نمایاں ہو۔ "ہجر کے موسم" کے مطالعے کے دوران ایک شعر پڑھ کہ ذہن پر عجب پُراسرار کیفیت طاری ہوگئی۔

کوئی آیا بھی نہیں ہے گھر میں
اس کا سایہ بھی ہے دیواروں پر

سعید قیسؔ نے جس نفسیاتی فضا میں یہ شعر کہا ہے میں خود اِس فضا سے دوچار ہو چکا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ

دیوار پہ دائرے ہیں کیسے
یہ کون ہے کس سے ڈر رہا ہوں میں

اِس جانفزا مجموعۂ غزل کے اور چند شعر سنیئے۔

نا اُمیدی یقین تک پہنچی
تجھ سے ملنے کی کوئی آس بھی ہو
میں نے سجدوں سے ابتدا کی ہے
اس محبت کی انتہا ہی نہیں
چہرے کچھ اور بھی ہیں پس پردہ وجود
کچھ شہر، شہر جان کے اندر بھی ہیں ابھی

شہر جان کے اندر کچھ اور شہروں کا ہونا ایمائیت اور رمز گوئی کی انتہا ہے۔ جدید غزل میں بہت سی نئی سمتیں اور ابعاد ہیں. اس میں شبہ نہیں۔ لیکن بسا اوقات جدّت پسندی اور روایت شکنی کی کوشش غزل کو معما در چیستاں بنا دیتی ہے۔ یہ نہیں تو غزل پایۂ غزل سے ساقط ہو کر تخرہ گوئی اور ہزل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ عام طور پر جناب سعید قیسؔ کا کلام اس نقص سے پاک اور اس عیب سے منزہ ہے ان کا تخیل

واضح، تفکر پُر از رمز ایما، اندازِ بیان نہایت دلکش اور مضامین نفسیاتی واردات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کی غزل سرائی سے ہماری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

رئیس امروہوی
۱۳ فروری ۱۹۸۰ء

ہجر کے موسم

سعید قیسؔ بلاشبہ اِسم بامُسمّٰی ہیں کہ شاعری کی جُملہ اصناف پر نگاہ رکھنے کے باوجود انہوں نے ''لیلائے غزل'' کی زُلفِ مشکبو کی اسیری کو سرمایۂ حیات سمجھا ہے اور اپنے آبائی وطن لاہور سے بحرین منتقل ہو جانے کے بعد بھی وہ غزل گوئی کے ہفت رنگ پردے میں مشقِ نام لیلا کرتے رہے وہ تو قیس عامری المعروف بہ مجنوں ہی تھا جو دیوارِ دبستاں پر لام الف لکھتا رہا۔

صحرا کو لاکھ کوئی تنگیٔ چشمِ حُسود سے تعبیر کرے لیکن کیا بجز قیس کوئی اور بروئے کار آیا اور کیا ''ہجر کے موسم'' کسی کو اِس قدر راس آئے کہ انہیں اُس نے عنوانِ شاعری بنا لیا ہو، یہ امتیازی کام تو سعید قیسؔ ہی نے کیا اور اِس خوبی اور خُوش اسلوبی کے ساتھ کیا کہ اس کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔

اے قیسؔ ہیں سرمایۂ جاں ہجر کے موسم
گُزرے ہیں کہیں دِل پہ گراں ہجر کے موسم

غزل اور صرف غزل ہی وہ دلرُبا اور جاں ستاں صنفِ سخن ہے جسے ہر دَور میں قبولِ عام کا شرف حاصل ہُوا۔ اِس نے غرباء کے عسُرت کدوں میں بھی کیف و سرُور کی شمعیں روشن کیں اور اُمراء کے عشرت محلوں کو بھی رقص و رنگ کے چراغوں سے منور کیا۔ اُردو یا فارسی، دونوں زبانوں میں، غزل جیسی پُر کشش، لطیف اور سحر انگیز صنفِ سخن شاید ہی کوئی ہو۔ یہ تو غزل ہی ہے جس کے جمالیاتی اور کائناتی پہلوؤں اور اعجاز بداماں خال و خد کے بارے میں وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ

زفرق، تابقدم، ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد ہ جا ایں جاست

یہ بالکل درُست ہے کہ ایک مدت تک غزل کا بنیادی موضوع حسن وعشق کی متنوع کیفیات کی ترجمانی رہا لیکن غزل کی یہ تعریف وتشریح نا تمام اور تشنہ ہے۔ اس کی افادیت واہمیت کا صحیح اندازہ کرنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اسے وصل وفراق کی مختلف کیفیات کی ترجمانی تک محدود سمجھنا غزل کے ساتھ صریح ناانصافی ہے۔ غزل میں ان موضوعات کے علاوہ بھی یقیناً بہت کچھ ہے غزل نے حیات وکائنات کے کم وبیش ہر رُخ پر توجہ کی ہے، ہر چیز پر فراخدلی سے نگاہ ڈالی ہے مہر وماہ ہی کو جولاں گاہِ فکر نہیں بنایا بلکہ ذروں میں بھی مشاہدہ مہر وماہ کیا ہے اور اپنی رمزیت وایمائیت کے لطیف ونازک پردوں میں اُن اسرار ورموزِ حیات وکائنات کی تصویر کشی کی ہے۔ جس تک دوسری اصنافِ سخن کی رسائی دشوار ہے۔ مقتدین کا دور ہو یا متوسطین کا متاخرین کا عہد ہو یا معاصرین کا، یہ غزل ہی کی ہمہ گیری اور اثر پذیری ہے کہ شعراء نے ہر دور میں اس کی طرف خاص طور سے توجہ کی یہی سبب ہے کہ ہر دور میں ان گنت غزل گو شعراء ہمیں نظر آتے ہیں۔ اگر آپ اسے مبالغہ سمجھتے ہیں تو اُردو شعراء کے بارے میں جو تذکرے وقتاً وقتاً لکھے گئے اُن پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے میرے دعوے کی تصدیق وتوثیق ہو جائے گی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غزل کی مقبولیت ولّی دکنی کے زمانے سے سعید قیسؔ کے زمانے تک کم نہیں ہوئی اور آج بھی اُردو میں غزل کے بے شمار شاعر ہیں۔ البتہ اس جم غفیر میں اِن کی درجہ بندی از بس ضرور ہے اور درجہ بندی تو ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ صف، اول میں تو جو شعراء ہیں اُن کے نام ہم انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ یہ شاعر تو پہلی صف میں بیٹھنے کا اہل نہیں ہوا کرتا۔

یہ رُتبۂ بلند، مِلا جس کو مِل گیا

ہر شاعر میر و غالب، اِنشاؔ و مصحفیؔ، آتشؔ و ناسخؔ، امیرؔ و داغؔ، انیسؔ و دبیرؔ، اقبالؔ و جوشؔ، جگرؔ و فانیؔ اور فراقؔ و فیضؔ کا حریف نہیں ہو سکتا اور اگر بننے کی سعی بھی کرے تو یہ خواب باید و شاید ہی شرمندہ تعبیر ہوگا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آج بونے اور باشیۓ بھی بیساکھیوں کا سہارا لے کر بزعمِ خویش، نعرہ بلند کر رہے ہیں۔

ہم یوسفِ کنعانِ سخن ہیں، ہمیں دیکھو

مگر انہیں وہی دیکھ سکتا ہے جو دیدۂ عبرت نگاہ رکھتا ہو۔ یا وہ شخص جس کے فانوسِ دماغ میں چراغ عقل روشن نہ ہو،

سعید قیسؔ نے بہ سلسلۂ معاش ترکِ وطن کے بعد بحرین کی فضا میں بھی شمعِ سخن کو روشن ضرور رکھا لیکن ان کے کلام سے کہیں مترشح نہیں ہوتا کہ وہ خود کو رشکِ میر یا حریفِ مصحفیؔ خیال کرتے ہیں، حالاں کہ بعض شعرا نے اپنی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے مِلا دیے ہیں۔ سنیے

پہلا شاعر میر ہوا اور اُس کے بعد ہوں میں
فرقانِ حمید شاعری لایا ہوں
ختم الرسل شعر ہوں، منِ جانب حق
قرآنِ مجید شاعری لایا ہوں

سعید قیسؔ نے اِس قسم کی تعلّی سے اپنے دامن کو بچایا ہے اور وہ اپنے شاعری کے محور ''ہجر کے موسم'' سے نہیں ہٹے ہیں، بحرین میں تو اُنہیں ''ہجر کے موسم'' کا ایک نیا رُخ نظر آیا۔ جس کا آئینہ دار اُن کا یہ شعر ہے۔

اے قیسؔ، یہ بحرین ہے لاہور نہیں ہے
رکھتے ہیں سماں اور یہاں ہجر کے موسم

اور ''ہجر کے موسم'' کا شاعرانہ تجزیہ تو وہی کر سکتا ہے جو ہمہ تن قیسؔ ہو اور محرومی قربِ جاناں جس کا مقدر بن چکی ہے۔ سعید قیسؔ کی غزلوں میں ہمیں جو تاثر جا بجا ملتا ہے وہ ان کے شعری مجموعے سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

پھول کی ڈالی پر کبھی نہ کبھی ہم سب کی نگاہ پڑی ہوگی لیکن ہم میں سے کتنے ہوں گے، جنہوں نے اِس مشاہدے کو شعر کے قالب میں اِس انداز سے ڈھالا ہو کہ بچھڑے ہوئے محبوب کی تصویر فردوسِ نظر بن جائے۔ سعید قیسؔ نے جب پھول کی ڈالی کو دیدۂ دِل سے دیکھا تو اُن کی فکرِ رسا کے مُوقلم نے اُردو غزل کے نگار خانے میں ایک ایسی دلکش تصویر آویزاں کر دی۔ جسے صَرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

دیکھ کر پھول کی ڈالی ہم نے
تیری تصویر بنالی ہم نے

اور جب وہ پھول کی ڈالی کو دیکھنے کے بعد اپنے محبوب کی تصویر کو مکمل کر لیتے ہیں، تو اُن کا ظلمت کدہ مطلع انوار بن جاتا ہے اور وہ بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں۔

جُز ترے، کچھ نظر نہیں آتا
کِس کے گھر میں ہے روشنی ایسی

مگر اس ارتکازِ توجہ کے بعد یہ تصوراتی روشنی ان کو ایک دُوسرے عالم میں لے جاتی ہے اور وہ بڑے والہانہ انداز سے کہتے ہیں۔

دیئے جلا کے، سرِ شام ہی سے بیٹھا ہوں
جو تُم نہ آئے تو اِس روشنی کا کیا ہوگا

اور پھر اُن کا وہ دِل جس نے پھول کی ڈالی دیکھ کر اپنے محبوب کی تصویر بنالی تھی۔ صرصرِ نا اُمیدی اور تپشِ ہجر سے دوچار ہو کر مُرجھا جاتا ہے۔

تپشِ ہجر سے مُرجھا گئے قیسؔ
دِل ہمارے تھے، گلابوں کی طرح

واقعی شاعروں کے دِل گُلابوں ہی کے مانند ہوتے ہیں۔ نہایت نازک، حساس اور سرد و گرم زمانہ کا تاثر قبول کرتے ہیں۔ اپنی نظیر آپ اور محبوب کو جب اپنے دِل میں اُتار لیتے ہیں، تو پھر آئینہ کائنات بھی اُن کی نظر سے گر جاتا ہے۔ چہ جائیکہ محض آئینہ؂

جب سے دِل میں اُتر گیا ہے وہ
ہم نے آئینہ توڑ ڈالا ہے

اور اگر خوش قسمتی سے رُوٹھا ہوا محبوب کہیں مل جائے تو اِن کے ویرانۂ دل میں بہار آ جاتی اور زبانِ قلم پر یہ شعر؂

دِل میں اِک پھُول کِھلا ہو جیسے
پھر وہ رستے میں مِلا ہو جیسے

اِن چند مثالوں سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ قیسؔ کی شاعری کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور اُن کی شاعری داخلی ہے یا خارجی وہ اپنی ہی بات کرتے ہیں یا زمانے بھر کی غمِ جاناں انہیں عزیز ہے کہ غمِ دوراں، ان کے دِل میں تمنائے وصل ہے یا وہ ''ہجر کے موسم'' ہی کو اپنی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ گردانتے ہیں۔ آپ اُن کے کلام پر نظر ڈالنے کے بعد اس کا اعتراف کریں گے۔ کہ سہل ممتنع اُن کی غزل کا ایک وصفِ ہے۔ جس نے اُن کے کلام میں ایک سحر حلالی کی کیفیت پیدا کر دی ہے اور اِسی کو از دل خیزد بر دلِ ریزد کہا جاتا ہے۔

آخر میں اُن کے غزلوں کے وہ چند شعر بھی قلمبند کر دوں جنہوں نے دوران مطالعہ مجھے متاثر کیا۔

ترکِ اُلفت بھی اِک ضرورت تھی
ہم نے سوچا تو ہم بہت روئے

بس ایک شوق و تمنائے دید ہے ورنہ
نفس نفس شب ہجراں کو کون گنتا ہے

دفعتاً آنکھ بھر آئی میری
آپ کا نام لیا تھا شاید

دیکھ کر پھول کی ڈالی ہم نے
تیری تصویر بنالی ہم نے

لے گئی گردشِ دوراں سب کچھ
اِک تری یاد بچالی ہم نے

جل اٹھا میں چراغِ شب کی طرح
آج کی شام کچھ ڈھلی ایسی

جُز ترے کچھ نظر نہیں آتا
کس کے گھر میں ہے روشنی ایسی

کوئی آیا بھی نہیں ہے گھر میں
اُس کا سایہ بھی ہے دیواروں پر

نااُمیدی یقین تک پہنچی
تجھ سے ملنے کی کوئی آس بھی ہو

دل کی بربادیاں تو دیکھ چکے
اور اب کیا ہے دیکھنا باقی

ابر برسا بھی تو دریاؤں پہ جا کر برسا

منہ کھلے رہ گئے تپتے ہوئے صحراؤں کے
جو میرے کام نہ آئیں انہیں دعاؤں کے

مرے لبوں پہ کئی زخم ہیں گلے کی طرح
ہم نے کس بات پر اُنہیں چاہا

ہم کو وہ بات ہی نہیں معلوم
اس نے دیکھا تھا پھول کا انجام

پھر کلی کیوں کھلی نہیں معلوم
آج وہ اتنا یاد آیا

سوگئے ہم روتے روتے
ایک ۰ جیسے اجار ہیں دونوں

دل کو دیکھوں کہ اپنا گھر دیکھوں

سرسری مطالعے کے وقت ان چند شعروں پر نظر ٹھہری اور یہ مجھے پسند آئے۔ اب میں آپ کو بھی شریک مطالعہ کر رہا ہوں۔ مطالعہ کے بعد آپ بھی جیسا کہ مجھے ایک حد یقین ہے اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ سعید قیس کا کلام رواں، سلیس و سادہ مگر رنگین و دِلا دیز، پُرتاثیر و جاں نواز ہے۔ سہلِ ممتنع میں اِس سے قبل کہہ چکا ہوں، گنجلک نام کو نہیں، ثقالت سے پاک اور محاسنِ شعری کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے لہٰذا مجھے اُمید ہے کہ سعید قیس کا یہ دُوسرا مجموعہ کلام ''ہجر کے موسم'' اُردو شاعری کے سرمایہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوگا اور اسے اُردو داں طبقے میں مقبولیت بھی حاصل ہوگی،

راغب مرادآبادی

۷ افروری ۱۹۸۰ء

کس سے کہیے

گفتنی ہے دل پر درد کا قصہ لیکن
کس سے کہیے کوئی متفسر حالات تو ہو

میر مولد شہر لاہور ہے۔ جہاں ۲۸ مئی ۱۹۲۷ء کو کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آیا۔ اصل نام محمد سعید ہے۔ مگر اب مجھے لوگ میرے قلمی نام سعید قیس ہی سے جانتے ہیں۔ موچی دروازہ میں ایک محلّہ ہے تکیہ سادُھواں جو کبھی اِسم بامسمّٰی ہوگا۔ میرے والد حاجی معراج دین، جو کشمیری الاصل تھے۔ اِس محلّے میں قیام پذیر تھے۔ میری تعلیم اِسی تاریخی شہر میں ہوئی اور میں نے ایف اے کی تکمیل یہیں کی۔ ایف اے کے بعد کالج سے بوجوہ تعلق منقطع ہوگیا۔ لیکن حصُولِ علم میرا شغلِ محبوب ہر دوَر میں رہا اور اب کہ میں بہ سلسلہ معاش بحرین میں ہوں اپنے لائحہِ عمل کا پابند ہوں۔ مجھے جس قدر وقت ملتا ہے۔ میں اسے معیاری کتب نثر ونظم، مذہب وثقافت اور دیگر علوم کی کتابیں پڑھنے میں صرف کرتا ہوں اور میرے مطالعے میں جتنی وُسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ مجھ پر جہل کی بے کراں وسعت کے نَو بہ نَو ابواب کھلتے جاتے ہیں۔ اور مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ

جہل بھی نا تمام ہے اب تک
ارے نادان آگہی کیسی

میں اچھے شعر کو ہمیشہ اچھا ہی خیال کرتا ہوں۔ اِس لئے کہ حضرت علیؓ کے بقول اُنظر اِلیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال۔ میں یہی دیکھتا ہوں کہ کیا کہا گیا یہ

نہیں کہ کہنے والا کون ہے۔ دہلوی، لکھنوی، اکبر آبادی، لاہوری، سیالکوٹی ہونا میرے نزدیک تشخص کی علامتیں ہیں۔ معیارِ سخن کی نہیں۔ اگر کوئی نَومشق اچھا شعر کہتا ہے۔ تو میرے نزدیک سزاوارِ دادو تحسین ہے۔ اگر کوئی کہنہ مشق غیر معیاری غزل کہتا ہے۔ تو محض اِس بنیاد پر مستحق داد نہیں کہ وہ پیر کہن سال وکہنہ مشق ہے۔

جہاں تک میری شعر گوئی کا تعلق ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ بچپن ہی سے مجھے اچھا شعر سننے اور پڑھنے کا شوق تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ میں نے خود بھی اس جادۂ پُر پیچ میں قدم رکھنے کی جسارت کی۔ میرا کلام ۱۹۵۰ء سے بعض رسائل و جرائد میں شائع ہونے لگا۔ اور میرا پہلا شعری مجموعہ ''حدیثِ غم'' آج سے ۱۲ برس پیشتر منظر عام پر آ گیا جسے پسند کیا گیا اور اِس طرح میری ہمّت افزائی بھی ہوئی۔

بحرین آنے سے پیشتر میرا قیام بہ سلسلۂ معاش سعُودی عربیہ میں بھی رہا لیکن وہاں شعروادب کی طرف زیادہ توجہ نہ ہو سکی۔ جب سے بحرین آیا ہوں۔ یہاں کی ''بزمِ سخن'' میں پابندی سے شرکت کر رہا ہوں، ''بزمِ سخن'' کے صدر جناب شاہد علی خاں شاہد نے میری کاوش کو نظرِ پسندیدگی دیکھا اور ہمّت افزائی کی، جانب الطاف رانا، جناب سرور عباس اور جناب نُور پٹھان کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس مجموعے کی اشاعت پر مجھے نہ صرف آمادہ کیا بلکہ میرے دل میں تحریک بھی پیدا کی۔

میں حضرت راغبؔ مراد آبادی اور محترمہ سلطانہ مہرؔ کا بھی تہہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس سلسلے میں تمام تر ذمہ داریاں بہ طیبِ خاطر قبول کیں۔

حضرت جوشؔ ملیح آبادی حضرت رئیس امروہوی اور پروفیسر منظور حسین شور کا شکریہ ادا کرنے سے زبانِ قلم یکسر عاجز وقاصر ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی کثیر

مصروفیات کے باوجود میرے کلام کو نہ صرف پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ بلکہ اس پر اظہارِ خیال کے لئے بھی اپنے قیمتی وقت میں سے بیش قیمت لمحات اس کے لئے وقف کئے۔

سعید قیس

۲۲ فروری ۱۹۸۰ء

بس ایک آرزوئے نا تمام ہے باقی
پلٹ پلٹ کے جو دل کو صدائیں دیتی ہے

تمہاری یاد جب آتی ہے ہاتھ اٹھائے ہوئے
تو جیسے مجھ کو محبت دُعائیں دیتی ہے

اُسے کہو کہ محبّت کا احترام کرے
بچھڑ گیا ہے تو ملنے کا انتظام کرے

قدم قدم پہ نئی منزلیں ہیں راہوں میں
سفر میں ہو تو مُسافر کہاں قیام کرے

کبھی تو ہجر کی یہ دُھوپ سر سے ڈھل جائے
کوئی تو رَاہ میں سائے کا اہتمام کرے

ہیں زخم زخم اگرچہ خموشیاں اس کی
میں اس کا کون ہوں مجھ سے وہ کیوں کلام کرے

میں ہوش میں بھی گوارا نہیں تھا قیسؔ جسے
نشے میں آج اسے کیا کوئی سَلام کرے

یاد کرلیتا ہوں اُلفت کے فسانے کتنے
مجھ کو مِل جاتے ہیں رونے کے بہانے کتنے

عمر اس نے بھی امیدوں میں گنوائی ساری
رنج ہم نے بھی اٹھائے ہیں نہ جانے کتنے

وصل کی رُت بھی گئی ہجر کے موسم بھی گئے
ہم نے اس عمر میں دیکھے ہیں زمانے کتنے

دل سا خوش فہم بھلا اور کوئی کیا ہوگا
تجھ سے ملنے کے بناتا ہے بہانے کتنے

نزع کے وقت مجھے آگ لگا دے کوئی
لوگ آئیں گے مرا بوجھ اٹھانے کتنے

زندگی بھر مجھے مایوس نہ ہونا آیا
حوصلے مجھ کو دیئے میرے خدا نے کتنے

جب بھی دیکھا کسی دیوار کا سایہ اے قیسؔ
یاد آئے مجھے غربت میں ٹھکانے کتنے

نشے غم کے ہیں شرابوں جیسے
اپنے دکھ بھی ہیں ثوابوں جیسے

آہ صدیوں سے یہ پیاسی آنکھیں
اور ترے نقش سرابوں جیسے

ہوئے آباد بیاباں کی طرح
گھر بسائے تو خرابوں جیسے

عشق رسوائیاں چاہے دل کی
اور ہم بند کتابوں جیسے

کون روئے گا ہماری خاطر
کس کے دیدے ہیں سحابوں جیسے

تپش ہجر سے مرجھا گئے قیسؔ
دل ہمارے تھے گلابوں جیسے

وہ مِل گیا مجھے رستے میں حادثے کی طرح
میں اس کو دیکھ کے جلتا رہا دیے کی طرح

مرے خمیر کی مٹی میں خفتیں ہیں بہت
میں ٹوٹتا نہیں یاروں کے حوصلے کی طرح

اجڑ گیا ہوں میں قدموں کی آہٹوں کے بغیر
اداس شہر کے سُنسان راستے کی طرح

وہ اپنی ذات کو جب چاہے دیکھ لے مجھ میں
میں اس کے سامنے رکھا ہوں آئینے کی طرح

جو میرے کام نہ آئیں انہی دعاؤں کی طرح
مرے لبوں پہ کئی زخم ہیں گلے کی طرح

فنا کا خوف ہے مجھ کو نہ کچھ بقا سے غرض
مرا وجود زمیں پر ہے سلسلے کی طرح

بلا کے رَنج ہوں یا قربِ انتہا کی خوشی
حدوں میں اپنی میں رہتا ہوں دائرے کی طرح

اسی زمین پہ آباد تھے جہاں کیا کیا
اُجاڑ دی ہیں ہواؤں نے بستیاں کیا کیا

یہی جگہ کبھی اپنا نشانِ منزل تھی
اسی جگہ کبھی رُکتے تھے کارواں کیا کیا

وفا کے باب میں گر اس کا نام آئے تو
مِرا مذاق اڑاتی ہیں تلخیاں کیا کیا

تجھے تو یاد ہی ہوگا اے آتشِ نمرود
لئے گئے ہیں محبت میں امتحاں کیا کیا

بیانِ شرح محبت کی لذتیں مت پوچھ
ہر ایک لفظ پہ رُکتی رہی زباں کیا کیا

شگفتِ غنچہ نے چونکا دیا مجھے ہر بار
کسی کے آنے کا ہوتا رہا گماں کیا کیا

تمہاری یاد جلاتی رہی دلوں کے سہاگ
چراغِ شام اگلتا رہا دھواں کیا کیا

یہ رات قیسؔ سمٹتی گئی قدم بہ قدم
سحر اٹھاتی رہی مجھ پہ انگلیاں کیا کیا

بے شک بہت اُداس ہے پر زندگی تو ہے
میں کتنا خوش نصیب ہوں مجھ میں کمی تو ہے

گردش میں کب سے ہے یہ اٹھائے مرا وجود
اب میرے بوجھ سے یہ زمیں کانپتی تو ہے

میں بولتا رہا تو یہ دیوار چپ رہی
خاموش ہوں تو اب یہ بلا بولتی تو ہے

جلتا ہوں روز شام کو گھر کے دیے کے ساتھ
مجھ بے خبر کو دوستو کچھ آگہی تو ہے

سوچوں تو سو گلے ہوں مجھے اس کی ذات سے
میں سوچتا نہیں یہ مری سوچ ہی تو ہے

ایسی اجاڑ ہی سہی تاریک ہی سہی
یہ رات میرے ساتھ مگر جاگتی تو ہے

اے قیس اک جمود سا طاری تھا روح پر
تھوڑا سا رو لیا ہوں تو راحت ملی تو ہے

پتّے پتّے کو دُھوپ کا ڈر ہے
سایۂ گل کہاں میسّر ہے

اپنے ہاتھوں سے توڑ مت اس کو
دل ترے ہی خیال کا گھر ہے

غم کی آبادیاں ہیں میلوں تک
شہرِ دل کا عجیب منظر ہے

سنگ زیرے نہ پھینک لوگوں پر
تیرے گھر میں بھی کانچ کا دَر ہے

ہم تو شیدائے آئینہ ہیں قیسؔ
ایک وہ ہے کہ آئینہ گر ہے

کل شب ہم نے چاند کو دیکھا یوں لگتا تھا بادل میں
ریشم کا پیوند لگا ہو جیسے کالی مخمل میں

بَرسوں کی خاموشی اس کے چہرے پَر آویزاں تھی
بول رہے تھے صدیوں کے سناٹے اس کے کاجل میں

میں ہر موسم میں اشکوں کے ہار پروتا رہتا ہوں
ڈال دیئے ہیں موتی اس نے اِن آنکھوں کی چھاگل میں

اَب جا کر یہ راز کھلا وہ مٹی سے کم قیمت تھا
سونے کی خوشبو آئی تھی یارو مجھ کو پیتل میں

اک اک بَات جَلائے اس کی تن کی گیلی لکڑی کو
سوچوں کے انبار لگے ہیں میرے دل کے جنگل میں

وہ بھی سمجھا تاروں ہی سے سارے نور کے میلے ہیں
میرے غم کی چھاپ لگی تھی جس کے نیلے آنچل میں

تن کی بات سمجھنے والا من کے روگ کو کیا جانے
دکھ کے کتنے گیت چھپے تھے اُس چاندی کی پائل میں

آج وہ میری خاطر پھر روئے گا نئے بہانوں سے
میں نے وہ آنکھیں دیکھی ہیں پھر ساون کے بادل میں

اک کانٹے کا زہر بدن میں یوں سرعت سے پھیلا قیسؔ
سارا جسم پھنسا ہے میرا آج لہو کی دلدل میں

❁

نہ جانے اپنی ہی سوچوں کا کوئی خاکا ہے
وہ ایک شخص جو ہر وقت دل میں رہتا ہے

میں کس خیال کی خوشبو کے دائرے میں ہوں
یہ کون ہے جو مرے آس پاس بکھرا ہے

نشے میں جب میں غموں کو بھلا کے گھر لوٹوں
تو پھر کہیں بڑی مشکل سے دن نکلتا ہے

بچا بچا کے وہ رکھتا ہے کانچ جیسا بدن
میں اس کو چھپ کے بھی دیکھوں تو ٹوٹ جاتا ہے

اک اس کے جانے سے خالی سا ہو گیا ہوں میں
مرا وجود مری روح کو ترستا ہے

تری جُدائی کی آتی ہے یاد رہ رہ کر
سفر میں جب بھی کوئی راستہ بدلتا ہے

کہاں مجال کہ میں اس کو اک نظر دیکھوں
کہ اس کے چہرے پہ سو آئینوں کا پہرا ہے

بس ایک شوقِ تمنائے دید ہے ورنہ
نفس نفس شبِ ہجراں کو کون گنتا ہے

خدا کرے کہ کبھی اپنی آنکھ سے دیکھوں
کہ میری آہ تمنا کا رنگ کیسا ہے

یہاں تھا وہ تو مجھے اس کا دھیان ہی کب تھا
چلا گیا ہے تو گھر ہی اُجاڑ لگتا ہے

دعائیں ہم نے بھی مانگی تھیں قیسؔ رو رو کر
اُجڑ گیا ہے گلستاں تو ابر برسا ہے

چاہتوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا
میں نے سوچا تو زمیں میں گڑ گیا

آرزو اس بُت کی یوں پیدا ہوئی
رَنج مجھ کو کھینچنا ہی پڑ گیا

وہ گیا تو آج سارے شہر کو
سانپ تنہائی کا جیسے لڑ گیا

آج ہم اس کو بھلا دیتے مگر
دل ہی ظالم اپنی ضد پر اڑ گیا

اس گلی میں آنا جانا روز کا
پاؤں میں اک اور چکّر پڑ گیا

قیسؔ دل میں روشنی ہونے لگی
اس کا غم کتنے نگینے جڑ گیا

در کو دیوار و در سمجھتے ہیں
گھر کے سائے کو گھر سمجھتے ہیں

دل شجر ہے تری محبت کا
زخم کو ہم ثمر سمجھتے ہیں

جو اندھیرے کو چیر دیتی ہے
اس کرن کو خبر سمجھتے ہیں

انتہائے حیات کو تو ہم
ابتدائے سفر سمجھتے ہیں

قیسؔ دعوے نہیں سخن پہ کوئی
شعر کو ہم ہنر سمجھتے ہیں

٭

بچھڑ گیا ہے تو اَب مجھ کو ڈھونڈتا ہوگا
گھڑی گھڑی وہ دریچوں سے جھانکتا ہوگا

وہ جس نے اوڑھ لیے ہیں ضرورتوں کے لباس
کبھی کبھی مرے بارے میں سوچتا ہوگا

ترے بغیر تو گلیاں اُجڑ گئی ہوں گی
تمام شہر کا نقشہ بدل گیا ہوگا

چمن میں جا کہ تجھے رازِ عشق ہو معلوم
مجھے یقین ہے پتوں پہ کچھ لِکھا ہوگا

دیے جلا کے سرِ شام ہی سے بیٹھا ہوں
جو تم نہ آئے تو اس روشنی کا کیا ہوگا

میں اس طرف بڑی مدّت ہوئی گیا ہی نہیں
تمہارے بعد تو گھر ہی اُجڑ گیا ہوگا

میں ڈر گیا تھا رواجوں کی بادشاہت سے
مجھے خبر ہے تمہیں مجھ سے کیا گِلا ہوگا

بہت دنوں سے معطر سا ہوگیا ہوں قیسؔ
وہ ٹوٹ کر کہیں مجھ میں بکھر گیا ہوگا

زیست کو آشنائے راز کرو
لغزشیں ہوں تو دل پہ ناز کرو
نشہ لازم ہے زندگی کے لیے
ان کی آنکھوں سے ساز باز کرو

بجلیوں میں جب آشیانہ تھا
وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا

تیر بس اک نظر کا تھا یارو!
اور سب کا جگر نشانہ تھا

تیرے کعبہ میں کس طرح جاتے
راستے میں شراب خانہ تھا

ان کے عہدِ وفا کی بات نہ پوچھ
کچھ حقیقت تھی کچھ فسانہ تھا

قیسؔ رونا تھا رو لیا ہم نے
آپ کا غم تو اک بہانہ تھا

دور اتنا رہے کہ پاس بھی ہو
مرے غم کا اسے قیاس بھی ہو

ناامیدی یقین تک نہ بڑھے
تجھ سے ملنے کی کوئی آس بھی ہو

تلخیاں بھی بہت ضروری ہیں
زندگی میں مگر مٹھاس بھی ہو

مجھ کو اس شخص کی تلاش ہے جو
مسکرائے تو کچھ اداس بھی ہو

دل بلبل میں بھی چھپی نہ رہی
اس محبت کا کچھ لباس بھی ہو

میری بردبادیوں کی بات نہ کر
یہ ترانغم کسی کو راس بھی ہو

لب دریا ہو گر میسر قیسؔ
تو مسافر کو تھوڑی پیاس بھی ہو

❁

اپنی آنکھوں کا میں ہنر دیکھوں
تجھ کو اے کاش بام پر دیکھوں

دل کا عالم ترے فراق کے بعد
زیر دیکھوں کبھی زبر دیکھوں

یہ میرا شوقِ انتظار نہ پوچھ
عمر بھر تیری رہ گذر دیکھوں

سَر میں سودا ترے جمال کا ہے
پتّہ پتّہ شجَر شجَر دیکھوں

جانے اس خواب کی ہے کیا تعبیر
اپنے ہاتھوں میں اپنا سَر دیکھوں

تجھ کو دیکھوں یہ آرزو ہے مِری
اور پھر کچھ نہ عمر بھر دیکھوں

ایک جیسے اجاڑ ہیں دونوں
دل کو دیکھوں کہ اپنا گھر دیکھوں

تیری خوشبو کہاں میسر ہے
صحنِ گلشن میں کس کا در دیکھوں

ہر تمنا ہے روح مریم کی
ہر تمنا کو دار پر دیکھوں

قیس دیکھوں کبھی قفس کی طرف
اور کبھی اپنے بال و پر دیکھوں

بچھڑ کہ پھر مجھے تیری خبر نہ آئے کبھی
میں انتظار کروں اور سحر نہ آئے بھی

ہزار چاہوں مگر میں تجھے بھلا نہ سکوں
خدا کرے کہ مجھے یہ ہنر نہ آئے کبھی

یہ سوچتا ہوں کہ کیوں تیرے روبرو ہو کر
مرا وجود مجھے بھی نظر نہ آئے کبھی

برہنہ سر جہاں پھرتی ہے آرزو میری
ترے نصیب میں وہ دوپہر نہ آئے کبھی

وصال کچھ بھی نہیں مرگِ آرزو کے سوا
مری دعا میں الٰہی اثر نہ آئے کبھی

کسی نے دیکھی بھی ہے منزل جنوں ابتک
جو تجھ کو ڈھونڈنے نکلے وہ گھر نہ آئے کبھی

جو دوست ملتا ہے تجھ کو ہی پوچھتا ہے قیسؔ
نظر میں پھر ترا نقشہ اُتر نہ آئے کبھی

گلی گلی میں اُسے ڈھونڈتا رہا برسوں
عجب تھا وہ بھی کہ مجھ میں چھپا رہا برسوں

جو ایک بار اُسے دل نے ٹوٹ کر چاہا
تو ربط عشق کا یہ سلسلہ رہا برسوں

میں دشت دشت تھا پھیلا ہوا سمندر تک
وہ موج موج تھا مجھ سے ملا رہا برسوں

حصارِ ذات اگرچہ تھا گردوپیش مرے
پر ایک در مرے اندر کھلا رہا برسوں

میں بارِ عشق اٹھا کر نہ چل سکا اے قیسؔ
بس اپنے سائے کے نیچے دَبا رَہا برسوں

کرب کی آندھیاں چلی ہیں بہت
دِل میں ویرانیاں ہوئی ہیں بہت

اک کلی کا مَلال کیا کرتے
صورتیں خاک میں دبی ہیں بہت

جب سے خاموش ہوگیا ہوں میں
گھر کی دیواریں بولتی ہیں بہت

اتفاقاً وہ مِل گیا تو ہمیں
چاہتیں یاد آ گئی ہیں بہت

یوں ہوا ذکر تیرے عارض کا
چاند کی عزّتیں لُٹی ہیں بہت

میں ہی اب اس طرف نہیں جاتا
اب وہ گلیاں اُجڑ گئی ہیں بہت

قیسؔ دل بھی اُداس ہے اپنا
اور آنکھیں بھی رو رہی ہیں بہت

محبتوں کا وہ چھوٹا سا سلسلہ ہی گیا
وہ اجنبی تھا مرے شہر سے چلا ہی گیا

ذرا سی دیر کو اس کا خیال آیا تو
وہ روشنی کی طرح مجھ میں پھیلتا ہی گیا

جو پیاس بن کے مرے ذہن میں رہا برسوں
وہ شخص خود مجھے دریاؤں سے ملا ہی گیا

وہ سنگ سنگ تھا شیشے کی عادتوں والا
مرے قریب سے گزرا تو ٹوٹتا ہی گیا

میں جب بھی قیسؔ سفر کے لئے روانہ ہوا
وہ دور تک مجھے رستے میں دیکھتا ہی گیا

✿

آج اندھیروں میں گر مجھ کو تنہا چھوڑ کے جاؤ گے
کل میری راہوں میں خود ہی دیپ جلانے آؤ گے

ممکن ہے ہم آوازیں سننے کے قابل ہی نہ رہیں
جب تم دل کے دروازوں پر آ کر سر ٹکراؤ گے

تم جن کی زلفوں کو چھو کر خوشبو لے کر آتے ہو
اُن کے پاس ہوا کے جھوکو ہم کو کب لے جاؤ گے

ہم نے ان کے پیار میں یارو کیا کھویا کیا پایا ہے
بس اتنی سی بات کسی دن تم ہم کو سمجھاؤ گے

اب تو ہم مدت سے ناصح مے نوشی بھی چھوڑ چکے
دیکھیں اب تم ہم مستوں پر کیا الزام لگاؤ گے

اے آنکھوں میں بسنے والو، ہم کو یہ معلوم نہ تھا
تم اک دن سینے پر غم کی دیواریں چن جاؤ گے

آنکھیں کب سے چورا ہے پر آس لگائے بیٹھی ہیں
دل کو توڑ کے جانے والو کب تک لوٹ کے آؤ گے

ہم تو پھر دل میں جلنے کی حسرت لے کر آئے ہیں
اب یہ کون بتائے تم کب تک آنچل سرکاؤ گے

درد نہ روتوں ہی کا بٹائے ہنستوں کے بھی نہ کام آئے
تم اے دنیا والو کب اس دنیا کو سمجھاؤ گے

اے فرزانو! عشق ہر اک انسان کے بس کی بات نہیں
قیس کی صورت لوگوں سے گلیوں میں پتھر کھاؤ گے

ہر لحظہ تیرے پاؤں کی آہٹ سنائی دے
تو لاکھ سامنے نہ ہو پھر بھی دکھائی دے

آ اس حیاتِ درد کو مل کر گزار دیں
یا اس طرح بچھڑ کہ زمانہ دہائی دے

تیرا خیال ہی مجھے آیا نہ ہو کہیں
اک روشنی سی آنکھ سے دل تک دکھائی دے

ملنے کی تجھ سے پھر نہ تمنا کرے یہ دل
اتنے خلوص سے مجھے داغِ جدائی دے

دیکھیں تو قیس لو بھی دیئے کی لگے ہے سرد
سوچیں تو گل کی شاخ بھی جلتی دکھائی دے

بے مہریٔ جہاں کی کوئی انتہا نہیں
اپنے ہی گھر میں کوئی مجھے جانتا نہیں

یہ اتفاق ہی تھا کہ تو مل گیا مجھے
ورنہ بچھڑ کے کوئی کسی سے ملا نہیں

دے دے کے دل پہ دستکیں مت آزما مجھے
مجھ کو خبر ہے یہ کوئی تیرے سوا نہیں

دنیا نے ایسے چھین لیں چہرے کی رونقیں
اب گھر کا آئینہ مجھے پہچانتا نہیں

میں سارا شہر چھان کے آیا ہوں جانِ قیسؔ
شاید تری گلی کا کوئی راستہ نہیں

اُن کی آنکھیں نم ہیں اب میرے لئے
کیسے کیسے غم ہیں اب میرے لئے

ریت کی دیوار مجھ پر گر پڑی
دشت میں ماتم ہیں اب میرے لئے

وہ گیا تو وصل کی رُت بھی گئی
ہجر کے موسم ہیں اب میرے لئے

روز اِک انداز سے ملتا ہے وہ
رُت نئے عالم ہیں اب میرے لئے

زلف کا بس ایک خم دیکھا تھا قیسؔ
لاکھ پیچ و خم ہیں اب میرے لئے

رنج تھا یا خوشی نہیں معلوم
عمر کیسے کٹی نہیں معلوم

جل گیا ایک پل میں پروانہ
شمع کب تک جلی نہیں معلوم

ہم نے کس بات پر انہیں چاہا
ہم کو وہ بات ہی نہیں معلوم

اُس نے دیکھا تھا پھول کا انجام
پھر کلی کیوں کھلی نہیں معلوم

یہ شب غم ترے خیالوں سے
کس طرح بچ گئی نہیں معلوم

منزل دل سے آج پھر ہم کو
کس نے آواز دی نہیں معلوم

قیسؔ اس کا مریض ہے یہ دل
جس کو چارہ گری نہیں معلوم

کب سے بیٹھا ہوں پانیوں کے قریب
پھر بھی صدیوں کی پیاس ہو جیسے
ایک اس شخص کے نہ ہونے سے
گھر کا گھر ہی اداس ہو جیسے

دل میں کیا کیا ملال آتے ہیں
خواب میں بھی خیال آتے ہیں

یوں بدن ٹوٹتا ہے یادوں سے
جیسے شیشے میں بال آتے ہیں

روز جاتے ہیں دیکھنے اُس کو
دل کی حسرت نکال آتے ہیں

جب نکلتے ہیں دشت ماضی میں
ہم ترے غم سنبھال آتے ہیں

کھولنے جب گئے ہیں عقدہ دل
اور اک گرہ ڈال آتے ہیں

قیسؔ جاتے ہیں روز میخانے
سو بلاؤں کو ٹال آتے ہیں

اپنی تنہائی سے اکثر ڈر گیا
رات کو جب دیر سے میں گھر گیا

سو کے اٹھا تو چمن ویران تھا
میری آنکھوں سے عجب منظر گیا

دھوپ سے مٹی کے گھر جلتے رہے
ابر برسا تو سمندر بھر گیا

درد میں لذت کہاں سے آ گئی
کون میرے دل پہ پاؤں دھر گیا

جگمگا اٹھا میں اس کو دیکھ کر
وہ میرے اندر اجالے کر گیا

پاؤں شل ہونے سے کتنا خوش ہوں میں
یہ گئے تو پاؤں کا چکر گیا

ہم اصولوں کے بڑے پابند تھے
بات کے بدلے ہمارا سر گیا

ریت کی دیوار تھی جو گر پڑی
ایک سایہ تھا جو آخر مر گیا

قیسؔ پھر وہ وحشتیں یاد آگئیں
جب مرے سر تک کوئی پتھر گیا

ذوقِ نگاہ کو کبھی لطف آشنا تو کر
تو نکہتوں میں ہی سہی لیکن ملا تو کر

پھر چشمِ التفات کو جنبش تو دے ذرا
پھر جرمِ عاشقی کی کوئی ابتدا تو کر

آ اتفاق سے مجھے دے جا کوئی گناہ
آ کر کسی ثواب کا کچھ سلسلہ تو کر

میں پھول ہوں تو کیوں ترے دامن سے جدا ہوں
تو خار ہے تو پھر کہیں دل میں چھپا تو کر

ویرانیاں ہماری کسی دن تو آ کے دیکھ
صحرائے دل میں آ کے کسی دن صدا تو کر

اے دوست غم کی لذتیں مجھ کو بھی ہوں عطا
آ دوستی کے نام پہ کوئی دغا تو کر

نوکِ زباں پہ قیسؔ جب آنے لگیں گلے
ہونٹوں کو ایک پل کے لیے سی لیا تو کر

راز اُگلے گئے ہیں سینوں سے
پھول کیا کیا کھِلے زمینوں سے

دل کی یہ بے قراریاں کیا ہیں
یہ اُداسی ہے کیوں مہینوں سے

ایسی بدلی زمین کی نیت
ہم کو پتھر ملے دفینوں سے

لگ گئی کچھ لہو میں آگ ایسی
لوگ جلنے لگے قرینوں سے

مجھ میں سو سو برائیاں ہیں قیسؔ
پوچھئے میرے نکتہ چینوں سے

گر نہ آنکھوں میں یہ دریا ہوتا
سرِ منزل بھی میں پیاسا ہوتا

اس کا ہونا ہی بہت ہے یارو!
وہ نہ ہوتا تو میں تنہا ہوتا

کاش یہ دل ہی نہ ملتا مجھ کو
اور ترا درد نہ پیدا ہوتا

اب وہ آنکھوں سے نکلتے ہی نہیں
ہم نے اتنا تو نہ سوچا ہوتا

میں تو سَر شارِ جنوں ہوں اے قیسؔ
تیرے سَر میں بھی تو سودا ہوتا

اپنا دیوانہ بنا دے مجھ کو
کچھ تو الفت کی سزا دے مجھ کو

آج تاریک ہے پھر شہر خیال
آ ذرا دیر جلا دے مجھ کو

آہ رسوائی دل کے ایام
پھر کوئی ڈھونڈھ کے لا دے مجھ کو

کوئی آئے شب تنہائی میں
تری باتوں میں لگا دے مجھ کو

قیسؔ اتنا بھی تو اس سے نہ ہوا
کبھی ہنس کر ہی رلا دے مجھ کو

جیسے تجھ سے کوئی گلہ ہی نہیں
ایک میں ہوں کہ سوچتا ہی نہیں

خاک اُڑنے لگی ہے گلیوں میں
جانے والوں کو کچھ پتہ ہی نہیں

تو کہ اب یاد ہی نہیں آتا
دل کہ اب تجھ کو بھولتا ہی نہیں

کچھ نہ دیکھا ترے جمال کے بعد
پھر نظر میں کوئی جچا ہی نہیں

میں نے سجدوں سے ابتدا کی ہے
اس محبت کی انتہا ہی نہیں

درو دیوار بھی خفا ہیں قیسؔ
اب کوئی ہم سے بولتا ہی نہیں

سانس گن گن کے جیا ہے یارو
کن گناہوں کی سزا ہے یارو

کب غمِ ہجر سے دل ڈوبے گا
چاند تو ڈوب چُکا ہے یارو

کوئی دروازے پہ جا کر دیکھے
وہ کھڑا ہے کہ ہوا ہے یارو

جب سے دیکھی ہیں وہ آنکھیں ہم نے
مے کدہ چھوٹ گیا ہے یارو

دل بھی رہنے کی جگہ تھی کوئی
غم کہاں آ کے بسا ہے یارو

خاکساری میں بھی؛ اک حسن ہے قیسؔ
پھول مٹی میں کھلا ہے یارو

جب ترے قرب کی سوغات ملے
پھر کہاں فرصتِ اوقات ملے

کب کھلے کاسۂ دل کی تقدیر
کب ترے حسن کی خیرات ملے

کیا ہو آزردگیِ دل کا عِلاج
غیر میں تجھ سی کوئی بات ملے

وہ ترستے نہیں بادل کے لئے
جن کی آنکھوں ہی میں برسات ملے

قیسؔ جن کو ملا شیشوں کا مزاج
ان کو پتھر کے سے حالات ملے

پنہاں نظر سے کچھ مری منظر بھی ہیں ابھی
اس جسم کے مکان میں کچھ در بھی ہیں ابھی

مجھ کو بھی ننگے پاؤں ہی چلنا ہے رات بھر
اور راستے میں خوف کے کنکر بھی ہیں ابھی

میں بھی کھڑا ہوں کانچ کی دیوار کے تلے
اور دوستوں کے ہاتھ میں پتھر بھی ہیں ابھی

چہرے کچھ اور بھی ہیں پس پردہ وجود
کچھ شہر شہر جان کے اندر بھی ہیں ابھی

اس دھوپ کو بھی اپنی تپش پر ہے کچھ غرور
کچھ سائبان سے مرے سَر پر بھی ہیں ابھی

ان کو ہوا اڑا کے نہ لے جائے اب کہیں
اپنے گھروں سے لوگ تو باہر بھی ہیں ابھی

مانا کہ منزلیں بھی بہت دور ہیں مگر
اے قیسؔ میرے پاؤں میں چکر بھی ہیں ابھی

زخم تھے آنکھوں میں پر روئے نہیں
درد سے ہم رات بھر سوئے نہیں

دھوپ ہی اس کا مقدر بن گئی
بیج جس نے سائے کے بوئے نہیں

دل کی دولت کی ضرورت تھی بہت
داغ ہم نے اس لئے دھوئے نہیں

غم نے دل کو ایسے پتھر کر دیا
چھن گیا وہ بھی تو ہم روئے نہیں

قیسؔ وہ تارا سحر دیکھے گا کیا
بوجھ جس نے شام کے ڈھوئے نہیں

بادِ ہجراں چلے تو اچھا ہو
ترکِ الفت رہے تو اچھا ہو

ان مقدس ضرورتوں کی قسم
تو کبھی نہ ملے تو اچھا ہو

آسماں کی اذیتوں سے چھٹوں
مجھ پہ چھت ہی گرے تو اچھا ہو

دل کی آسودگی سے ڈرتا ہوں
زندگی رو پڑے تو اچھا ہو

سب کو حسرت ہے تجھ سے ملنے کی
کوئی سُولی چڑھے تو اچھا ہو

عشق رہزن ہے دولتِ دل کا
کوئی گھر میں رہے تو اچھا ہو

دل تو صدیوں سے جل رہا ہے قیسؔ
اب کے گھر ہی جلے تو اچھا ہو

تیری یادوں کے قافلے دن رات
دل کے صحرا سے یوں گزرتے ہیں
جیسے کوئی اذان دیتا ہے
جیسے مندر میں سنکھ بجتے ہیں

جانے کس بت کا خیال آتا رہا
اک دیا سا رات بھر جلتا رہا

وہ جگہ ہم دونوں ملتے تھے جہاں
آج میں تنہا وہاں پھرتا رہا

نام تھا اس کا نہ کوئی ذات تھی
جو مجھے ہر موڑ پر ملتا رہا

لوگ ہنسنے میں بہت مصروف تھے
میں کھڑا بس ان کا منہ تکتا رہا

ان کی یاد آئی تو آنسو آ گئے
غم کا دریا تھا کہ بس چڑھتا رہا

قیسؔ پہچانی ہوئی آواز تھی
کون تھا جو صبح تک روتا رہا

دل بجھا ہے تو داغ جلتے ہیں
تا سحر کچھ چراغ جلتے ہیں

جستجو ہے شرار کی صورت
نقشِ پا سے سُراغ جلتے ہیں

کبھی کھلتے ہیں پھول شعلوں میں
کبھی شبنم سے باغ جلتے ہیں

آرزو ہے انہیں اُجالوں کی
جن کے گھر میں چراغ جلتے ہیں

عنبریں زلف کی ہوا توبہ
نکہتوں کے دماغ جلتے ہیں

میں تری یاد اوڑھ لیتا ہوں
جب گلی میں چراغ جلتے ہیں

قیسؔ ہم سے ہے میکدہ روشن
ہم برنگِ ایاغ جلتے ہیں

جب ترا عکس پڑا شیشوں پر
درد سا پھیل گیا چہروں پر

کچھ ترے جسم سے خوشبو میں اُڑیں
کچھ ترا رنگ چڑھا پھولوں پر

دشت پیاسا تھا وہ پیاسا ہی رہا
ابر برسا بھی تو دریاؤں پر

کوئی آیا بھی نہیں ہے گھر میں
اس کا سایہ بھی ہے دیواروں پر

بستیاں خاک ہوئیں اس کے بغیر
اک بلا ٹوٹ پڑی شہروں پر

قیسؔ جب گلیوں میں جلتے ہیں چراغ
آنکھ لگ جاتی ہے دروازوں پر

❁

اس گلی سے اگر کبھی گزروں
ہر قدم پہ ٹھہر ٹھہر کے چلوں

اپنے سائے سے خوف آئے مجھے
ترے غم کو چھپا چھپا کے پھروں

ہر نفس میں ہے آرزو تیری
ہر نفس کو ہزار بار گنوں

جس طرف تو نظر نہ آئے مجھے
بھُول کر بھی نہ اس طرف دیکھوں

غم کی وہ بستیاں بساؤں میں
قریۂ دِل اُجاڑ کر بیٹھوں

بس یونہی دیکھتا رہوں تجھ کو
صبح تک آنکھ بھی جھپک نہ سکوں

تو کہیں منزلوں پہ جا پہنچے
میں کہیں راستے میں رہ جاؤں

شاید اب زندگی وفا نہ کرے
شاید اب تجھ کو دیکھ بھی نہ سکوں

اشک بن جائے قیسؔ میرا وجود
اور میں ابر کی طرح برسوں

عشق رسوا نہ ہو تو کیونکر ہو
غم کا چرچا نہ ہو تو کیونکر ہو

اک مسلسل عذاب ہجراں کا
ہم نے چاہا نہ ہو تو کیونکر ہو

اب کہیں بھی نظر نہیں رُکتی
کوئی تجھ سا نہ ہو تو کیونکر ہو

زندگی کی دُعا نہ دو یارو!
مجھ کو جینا نہ ہو تو کیونکر ہو

گھر سے میں کس امید پر نکلوں
کوئی اپنا نہ ہو تو کیونکر ہو

آنکھ بھی اک زبان ہے اے قیسؔ
وہ سمجھتا نہ ہو تو کیونکر ہو

جب کوئی دل کو نئی ٹھیس لگے
تازہ ہوجائیں نہ غم برسوں کے

آہ ویرانیِ گلشن کا خیال
کانپ اٹھتا ہوں ہوا کے ڈر سے

روح پیاسی ہے زمینوں کی طرح
اب گھٹا چھائے تو کھُل کر برسے

کون دیکھے دَرودیوار کا غم
کب سحر ہو تو میں نکلوں گھر سے

ایک ہنگامہ ہے دل کی قیمت
کوئی آئے مجھے رسوا کردے

غم کی وسعت بھی تھی صحرا کی طرح
زخم بھی گہرے تھے دریا جیسے

جب بھی وہ چوٹ لگاتا ہے تو قیسؔ
ٹوٹنے لگتا ہوں میں اندر سے

دل مسکن آزار، نظر شورش غم تھی
اس پہ بھی جہاں سے ہمیں امیدِ کرم تھی

کس زاویۂ شوق سے ہم دیکھتے اس کو
جس سمت گئے ہیں وہیں دیوار حرم تھی

بلبل کی زباں پر تھا ترا ذکرِ مسلسل
پتوں کی جبیں پر تری تاریخ رقم تھی

دیکھا جو ترا حسن تو کھولی نہیں آنکھیں
دنیا کی ہر اک شے ترے معیار سے کم تھی

دل تھا مرے سینے میں کہ بت خانۂ آذر
ہر ایک تمنا جہاں پتھر کا صنم تھی

اس نے بھی اٹھائے تھے زمانے کے ستم قیسؔ
اور سوزشِ ہجراں سے مری آنکھ بھی نم تھی

نہ ملا پھر مرا پتہ مجھ کو
اک جہاں ڈھونڈتا رہا مجھ کو

میں گنہگار ہوں محبت کا
دے کوئی وصل کی سزا مجھ کو

کس کو کس سمت لے گئی آندھی
یہ تو آ کر کبھی بتا مجھ کو

آج کا دن گزر گیا یوں ہی
آج بھی تو نہیں ملا مجھ کو

میں روانہ ہوا سفر کو تو وہ
دور تک دیکھتا رہا مجھ کو

آج پھر وہ بہار کا موسم
یاد آیا ذرا مجھ کو

قیسؔ ان کا سمیٹنا مت پوچھ
راس آیا ہے ٹوٹنا مجھ کو

کسی خیال سے اس شہر کو وہ چھوڑ نہ دے
ڈرے ہوئے تھے بہت رات رات بھر جاگے

سنی تھی پہلے پہل جس جگہ صدائے جرس
رُکے ہوئے ہیں وہیں آج قافلے دل کے

مرا نصیب میں منزل کو جب روانہ ہوا
تو فاصلے بھی مرے ساتھ ساتھ چلتے رہے

ہر اک گلی تھی ترے شہر کی گلی جیسی
سفر میں ہم تری خاطر کہاں کہاں رُکتے

جو ہم نے سوچا تو اک داغ تھا جوانی کا
جو دل کا غور سے دیکھا تو زخم گہرے تھے

اداس پتوں کو صدیوں کی پیاس ہے یارب
وہ ابر بھیج کہیں سے جو رات بھر برسے

چمن میں پھر نہ ہوئی عندلیب نغمہ سَرا
تمہارے بعد اگرچہ ہزار پھول کھلے

وہ سارے شہر میں بدنام ہوگیا ہے قیسؔ
مری طرح سے کوئی زخم اوڑھ کر نہ پھرے

جب کوئی غنچہ سرِ شاخ کھلا
جانے کیوں آنکھ بھر آئی میری
کتنے زخموں کا جگر چاک ہوا
کس نے دہرائی کہانی تیری

اس نے محبتوں کے عجب ہی صلے دیے
میں رو پڑا تو مجھ کو بڑے حوصلے دیے

اے ماہ تیری نور کی کرنوں کو کیا ہوا
تو نے وہ سارے چاند سے چہرے کسے دیے

آیا جو تیرا ذکر تو خوشبو بکھر گئی
مجھ کو ترے خیال نے کیا کیا نشے دیے

ترتیب زندگی کوئی مشکل نہ تھی، مگر
قسمت نے ہم کو ہاتھ ہی ٹوٹے ہوئے دیے

میں تو نشے میں تھا مجھے کچھ بھی خبر نہ تھی
خود میری منزلوں نے مجھے راستے دیے

یارو جب وہ تنہا ہوگا
مجھ کو یاد تو کرتا ہوگا

میں نے آپ اُجاڑا ہے گھر
کوئی میرے جیسا ہوگا

صحرا میں کیا لینے جائیں
یہ بھی اپنے گھر سا ہوگا

ہم جی بھر کے روئے ہوں گے
وہ جب ہم سے بچھڑا ہوگا

آنکھ چُرا کر جانے والا
یہ بھی کوئی اپنا ہوگا

میرے دامن میں کچھ تو ہے
پھول نہیں تو کانٹا ہوگا

قیسؔ ان کے سینے میں شاید
کوئی کانچ کا ٹکڑا ہوگا

وہ جب سامنے آئے ہوں گے
دل کے اور ہی نقشے ہوں گے

میری آنکھیں اور یہ تارے
دونوں رات کو جاگے ہوں گے

اُن کی یاد جب آئی ہوگی
ہم صدیوں تک روئے ہوں گے

میں بھی غم سے چُور ہوا ہوں
دکھ اس نے بھی دیکھے ہوں گے

وہ جس راہ سے گزرا ہوگا
اس کے مقدر کیسے ہوں گے

قیسؔ اس بستے شہر میں جانے
کتنے ہی گھر اُجڑے ہوں گے

یہ جو مستی سی اک صبا کی ہے
سب شرارت تری ادا کی ہے

دل کو اُن سے شکایتیں بھی ہیں
اور محبت بھی انتہا کی ہے

پھر جلائے ہیں آرزو کے چراغ
پھر تمنا مجھے ہوا کی ہے

ایک دُکھ ہو تو کوئی بات نہیں
یہاں مشکل ذرا ذرا کی ہے

قیسؔ دنیا ہے گوش بر آواز
منتظر اک تری صدا کی ہے

❁

گھر کا پردہ بھی کوئی ہلتا نہیں
اب مری آواز بھی سنتا نہیں

اس گلی کے سب دریچے بند ہیں
روشنی کا در کہیں کھلتا نہیں

آگ میں نے بھی لگائی تھی مگر
کیوں مرے گھر سے دھواں اٹھتا نہیں

کس کی خاطر دوڑتے پھرتے ہیں لوگ
کوئی سائے کو پکڑ سکتا نہیں

وہ بھی خوش ہے ترکِ الفت پر بہت
غم پہن کر میں بھی اب پھرتا نہیں

چونک اٹھتا تھا مری آہٹ سے وہ
راستے میں بھی وہ اب ملتا نہیں

اس قدر بے گانگی ہے آس پاس
جیسے اب میں اپنے گھر رہتا نہیں

قیسؔ مجھ کو دوستوں پر ناز ہے
دشمنوں سے میں کبھی جلتا نہیں

بہت اُداس ہیں سوچیں نہ جانے کیا چاہوں
میں دن کو نکلوں تو پھر گھر نہ لوٹنا چاہوں

ترے وصال کی لذّت چھپا چھپا کے پھروں
ترے خیال کی خوشبو میں تیرنا چاہوں

نفس نفس سے تری قربتوں کی آنچ آئے
ترے خیال کو یوں آج اوڑھنا چاہوں

وہ ریزہ ریزہ بکھرنے کی کوششیں اپنی
اور اب یہ حال کہ تنکے سمیٹنا چاہوں

کوئی ہنسے تو میں رونے کی لذّتیں ڈھونڈوں
کسی کو تیرتا دیکھوں تو ڈوبنا چاہوں

وہ مجھ کو دیکھے تو جنّت کے خواب دیکھوں میں
وہ مجھ کو چاہے تو اندر سے ٹوٹنا چاہوں

عجیب شے ہے ترے وصل کی تمنا بھی
ہر ایک پھول کو ڈالی سے توڑنا چاہوں

نا آشنا کے زخم کبھی آشنا کے زخم
کھائے ہیں ہم نے دوستو کس کس بلا کے زخم

پھولوں سے اپنی جھولیاں بھرنے کا تھا خیال
ہونٹوں پہ جم گئے ہیں وفورِ دُعا کے زخم

مت پوچھئے چراغ تمنا کو کیا ہوا
اب تک مٹے نہیں ہیں نظر سے ہوا کے زخم

اک اک کلی کو کر گئی گلشن میں مست ناز
بلبل کے دل سے پوچھئے بادِ صبا کے زخم

کشتی کے غم کے ساتھ دعا کا بھی تھا ملال
کچھ ناخدا کے زخم تھے اور کچھ خدا کے زخم

ہے داستانِ عشق لبِ عندلیب پر
رسوائیاں ملی ہیں گلوں کو دکھا کے زخم

مجبوریٔ حیات ہی اصل حیات ہے
ہنستے ہیں لوگ قیسؔ دلوں میں چھپا کے زخم

کچھ ایسی تیز ترے درد کی ہوا بھی نہیں
مرا وجود مرے بوجھ سے جُھکا بھی نہیں

دیارِ غیر میں ہم ڈھونڈنے کہاں جاتے
اس ایک شخص کو جو ہم کو جانتا بھی نہیں

یہ میں کہ اس کی محبت کو چھو نہیں سکتا
یہ دل کہ اور کسی شے کو چاہتا بھی نہیں

جو سوچتا ہوں تو آہٹ سنائی دیتی ہے
جو دیکھتا ہوں تو گھر میں کہیں ہوا بھی نہیں

غموں سے چور سہی پھر بھی زندگی تو ہے
میں اپنے سائے کو پاؤں میں روندتا بھی نہیں

جو یاد آئے تو کیا کیا ستم اٹھاتا ہوں
وہ جس کو دل سے بھلانے کا حوصلہ بھی نہیں

یہ اپنا ظرف کہ کھلتی نہیں زباں اے قیسؔ
یہ اس کا رنگ کہ اب ہم سے بولتا بھی نہیں

اک رَبط سا ہے آج تک دَردآشنا کے ساتھ
کیا کیا نہ غم دیئے مجھے اس نے دوا کے ساتھ

اس شوقِ جستجو کے مزے ہم سے پوچھیے
ہم دور تک گئے ہیں ہر اک نقشِ پا کے ساتھ

جی چاہتا نہیں تو نہیں مانگتے دُعا
دھوکہ نہیں کیا کبھی ہم نے خدا کے ساتھ

جیسے مرا وجود اک ابرِ بسیط تھا
اُڑتا چلا گیا ہوں تری ہر صدا کے ساتھ

اک انتشار ذات کا عالم تھا روبرو
پتے سے اڑ رہے تھے چمن میں ہوا کے ساتھ

آزردگیِ دِل کی گراں باریاں تھیں قیسؔ
ہم دفن کر دیئے گئے جرمِ وفا کے ساتھ

وہ یہاں تھے میہمانوں کی طرح
دل ہے اب خالی مکانوں کی طرح

ہم کڑکتی دھوپ میں زندہ رہے
ان کا غم تھا سائبانوں کی طرح

دل کا دروازہ کھلا رکھتے ہیں ہم
شہر میں چلتی دکانوں کی طرح

درد ہجراں سے یہی پتھر کے لوگ
ٹوٹ جاتے ہیں چٹانوں کی طرح

اس کو کس کس بات کا دیتے جواب
چپ رہے ہم بے زبانوں کی طرح

قیس اب کوئی یہاں رہتا نہیں
ہم ہیں اب خالی مکانوں کی طرح

خلوصِ دل سے ترا احترام کیا کرتے
یہ لوگ اہل محبت میں نام کیا کرتے

کسے بتاتے کہ آزارِ عشق ہے ہم کو
خود اپنے راز کو دنیا میں عام کیا کرتے

وہ ایک کاوش بے سود تیرے ملنے کی
وہ ایک آرزوئے ناتمام کیا کرتے

ہمیں خبر تھی کہ ترتیبِ زندگی کیا ہے
ترے بغیر مگر انتظام کیا کرتے

کھلی جو آنکھ تو ہر چیز پر اندھیرا تھا
گزر چکی تھی سحر وقتِ شام کیا کرتے

ملا تو تھا وہ سرِ رہگذار ہم کو مگر
بہت اداس تھا اس سے کلام کیا کرتے

وہ آنکھ اٹھا کے ہمیں قیسؔ دیکھتا ہی نہیں
تو راستے میں اُسے ہم سَلام کیا کرتے

دل چاک چاک اور جگر لخت لخت تھا
شاید کہ ہم کو عشق میں رنجِ شکست تھا

ہر شے پہ چھا گیا تھا ترا پرتوِ جمال
رسوائیوں کا میری عجب بندوبست تھا

آنکھوں کے سامنے تو تھی ویرانیِ حیات
دیکھا تو میری روح کے اندر بھی دشت تھا

تنہا کھڑا تھا ذہن میں جو صورتِ شجر
دیکھا جو غور سے تو ہمارا ہی بخت تھا

میں جب بھی اس کے پاس گیا دامن تہی
وہ جب بھی راستے میں ملا، گل بدست تھا

ہم نے تجھے بھلا ہی دیا مدّتوں کے بعد
ہر چند دل کے واسطے یہ کام سخت تھا

دیکھا اسے تو ڈال دیں بانہیں گلے میں قیسؔ
میں نشۂ فراق میں کس درجہ مست تھا

اس گلبدن کی آنکھ میں مے کا خمار تھا
اس حادثے کا نام ہی یارو بہار تھا

ہم ان کو دیکھنے کی بھی جرأت نہ کر سکے
جن کو ہمارے دل پہ بڑا اختیار تھا

دیکھا تو ایک ربط تھا ہر شے کے درمیان
سوچا تو زندگی میں بڑا انتشار تھا

ہم دھوپ کے لئے بھی دعا مانگتے رہے
سائے کی زندگی سے ہمیں کتنا پیار تھا

ہم اس کو جانتے ہیں بڑی مدتوں سے قیسؔ
وہ شخص زندگی میں بڑا بے قرار تھا

کھل گئے بند دریچے جو کبھی یادوں کے
زخم ہی زخم نظر آنے لگے باتوں کے

کبھی ہنستا کبھی روتا تھا میں اس کی خاطر
عجب انداز تھے کل رات مِری سوچوں کے

روز آتے ہیں یہاں کس کے لئے پوچھ تو لو
اب یہ اُجڑے ہوئے سائے تری دیواروں کے

ابر برسا بھی تو دریاؤں پہ جا کر برسا
منہ کھلے رہ گئے تپتے ہوئے صحراؤں کے

تجھ کو کھویا ہے تو پھر جا کے یہ سمجھا ہے کہیں
رنگ اُڑ جاتے ہیں کیوں ہنستے ہوئے چہروں کے

ہر محبت کے مقدر میں ہے رسوائی شوق
کان دروازوں کے ہوتے ہیں نہ دیواروں کے

اب تو کانٹوں میں بھی رہتے ہیں تو خوش ہیں جیسے
خواب ان آنکھوں نے دیکھے تھے بہت پھولوں کے

آپ آئے ہیں کہ جھونکا ہے ہوا کا کوئی
کس لئے ہلتے ہیں پردے مرے دروازوں کے

گھر اجڑنے کا عبث رنج ہے اے قیس تمہیں
دل اُجڑ جاتے ہیں اس شہر میں انسانوں کے

دشت میں رہ گئی ہوا باقی
مڑ کے دیکھا تو کچھ نہ تھا باقی

آنکھ جھپکی تو رات بیت گئی
رہ گیا رات کا نشہ باقی

دل میں اس بُت کی آرزو کے سبب
ایک در ہے کھلا ہوا باقی

تھک گیا ہوں میں قافلے والو
اور کتنا ہے راستہ باقی

دل کی بربادیاں تو دیکھ چکے
اور اب کیا ہے دیکھنا باقی

قیسؔ وہ شخص کیا ہوا جس سے
ایک رشتہ تھا درد کا باقی

زمانے کے سِتم تو سہہ گئے ہم
مگر کہنا تھا جو کچھ کہہ گئے ہم

سمجھتے تھے کہ ہم سنگِ گراں ہیں
بس ایک موجِ نفس میں بہہ گئے ہم

ہوا کب ہم سے اظہارِ تمنا
کچھ اپنے دائروں میں رہ گئے ہم

یہ تب جانا کہ ہم مٹی کا گھر تھے
چلی جب آندھیاں تو ڈھ گئے ہم

چلے تھے سب سے پہلے قیسؔ گھر سے
سفر میں سب سے پیچھے رہ گئے ہم

عشق نے یوں ہمیں اُچھالا ہے
حوصلے دے کے مار ڈالا ہے

چاندنی بھی چراغ بھی تم بھی
آج گھر میں بڑا اُجالا ہے

جب سے دل میں اُتر گیا ہے وہ
ہم نے آئینہ توڑ ڈالا ہے

جو تری آرزو سے بچ نکلے
وہ بڑا ہی نصیب والا ہے

آج ہم نے شراب پی کر قیسؔ
سو بلاؤں کو سر سے ٹالا ہے

کبھی کبھی تجھے آواز دوں تو کیسے ہو
تمہارا ہاتھ پکڑ کر چلوں تو کیسے ہو

ترے وجود سے ہے میری شاعری کا جمال
کوئی غزل تری خاطر کہوں تو کیسے ہو

تو میرے ساتھ رہے گردشِ زمیں کی طرح
میں شب کا چاند ہوں ڈھلتا رہوں تو کیسے ہو

تمام عمر وہ مجھ کو سمیٹتا ہی رہے
میں ٹوٹ ٹوٹ کے بکھرا کروں تو کیسے ہو

خدا کرے کہ میں الفت کا راز بن جاؤں
تمہاری آنکھوں میں چھپتا پھروں تو کیسے ہو

یہ میں کہ مجھ کو ترے ساتھ بھی قرار نہیں
ترے بغیر بھی زندہ ہوں تو کیسے ہو

چراغ جلتا ہے گھر میں تو سوچتا ہوں قیس
اسی طرح کبھی میں بھی جلوں تو کیسے ہو

رنگ سا کوئی اڑا تھا شاید
پھول کا خون ہوا تھا شاید

دل کہ ٹوٹا ہے چٹانوں کی طرح
میں بلندی سے گرا تھا شاید

تو ہی آیا نہیں برسوں سے ادھر
گھر کا دروازہ کھلا تھا شاید

بجھ رہے تھے تری گلیوں کے چراغ
اور میں جاگ رہا تھا شاید

دفعتاً آنکھ بھر آئی میری
آپ کا نام لیا تھا شاید

ہم نے پہچانا نہیں قیسؔ اسے
کل وہ رستے میں ملا تھا شاید

آئینے پر نظر پڑی ہوگی
ان کی تصویر ہی جڑی ہوگی

سوچتے ہیں کہ شیخ کی جنت
تری آنکھوں سے بھی بڑی ہوگی

دل کے رستے میں ہاتھ پھیلائے
کوئی امید ہی کھڑی ہوگی

زلف بکھری تو ہم نے جان لیا
دھوپ غم کی بہت کڑی ہوگی

دل کی بربادیاں خدا کی پناہ
خود محبت بھی روپڑی ہوگی

پھر سر شام آنکھ میں آنسو
پھانس دل میں کوئی گڑی ہوگی

وصل کی بات پوچھتے ہو قیسؔ
نوکِ شب پر کہیں اڑی ہوگی

آنکھ جب سے لڑی ہے کیا کیجے
سخت مشکل پڑی ہے کیا کیجے

منزلِ دل سے چند قدموں پر
اک تمنا کھڑی ہے کیا کیجے

میری مشکل کا پوچھتے ہیں آپ
آسماں سے بڑی ہے کیا کیجے

آرزوئے وصال تھی وہ بھی
نوکِ شب پر اڑی ہے کیا کیجے

قیسؔ کٹتی نہیں شبِ ہجراں
سو برس کی گھڑی ہے کیا کیجے

ماضی دیتا رہا صدا
لیکن میں خاموش رہا

دونوں ملکر چلتے تھے
تیرا اور میرا سایا

ہم ہی رستہ بھول گئے
اس کا گھر تو دور نہ تھا

مجھ سے بھی چھوٹا ہے نگر
تو بھی اپنے گھر کو نہ جا

میں نے بھی کوشش نہیں کی
اور اس نے بھی کچھ نہ کہا

مُڑ کر جب دیکھا میں نے
کوئی میرے ساتھ نہ تھا

وہ بھی ایک بشر تھا قیسؔ
لیکن اس کا دل ہی نہ تھا

اجنبی کا خلوص کیا کہیے
دوستوں کا خیال آتا ہے
کتنا نازک ہے دل کا آئینہ
ایک جنبش سے ٹوٹ جاتا ہے

اس نے دیکھا بھی نہیں
ہم تماشا بھی نہیں

دل کہ صحرا نہ ہوا
آنکھ دریا بھی نہیں

کبھی حسرت تھی تری
اب تمنا بھی نہیں

ہم تجھے بھول گئے
ہم نے سوچا بھی نہیں

وہ جدائی ہے کہ بس
میں اکیلا بھی نہیں

اس کی باتیں ہی کرے
کوئی ایسا بھی نہیں

قیسؔ آنکھیں تھی ہیں تر
اور میں رویا بھی نہیں

دل میں اک پھول کھلا ہو جیسے
پھر وہ رستے میں مِلا ہو جیسے

مرے ہونٹوں پہ یہ اک حرفِ دُعا
زندگی بھر کا گِلا ہو جیسے

ہر گھڑی تیرے خیال آتے ہیں
گھر کا دروازہ کھُلا ہو جیسے

کب سے بولا نہیں دیوار پہ کاگ
وہ مجھے بھُول گیا ہو جیسے

پھُول کھلتا ہے تو یہ سوچتا ہوں
تیرے قدموں کی صدا ہو جیسے

یوں اُسے دیکھ کے چپ ہوں اے قیسؔ
کوئی کچھ سوچ رہا ہو جیسے

ترے کوچے سے گداؤں کی طرح
ہم پلٹ آئے صداؤں کی طرح

دل ہمارا بھی کبھی تھا آباد
اب ہے اُجڑے ہوئے گاؤں کی طرح

ہر قدم پہ یہ گماں ہے جیسے
تو مرے ساتھ ہے چھاؤں کی طرح

اب تری یاد کہاں سے آئے
دل میں سو غم ہیں بلاؤں کی طرح

یہی آنکھیں کبھی ہنستی تھیں سدا
اب برستی ہیں گھٹاؤں کی طرح

آہ ہم گرِ خزاں دیدہ ہیں قیسؔ
اور درد اس کے ہواؤں کی طرح

چاند نکلا تو ہم بہت روئے
وہ نہ آیا تو ہم بہت روئے

اس کی خوشبو اڑی گلستاں میں
پھول مہکا تو ہم بہت روئے

تجھ سے ملنے کے سو بہانے تھے
دل نہ مانا تو ہم بہت روئے

آج دل کی اُجاڑ گلیوں سے
پھر وہ گزرا تو ہم بہت روئے

ترکِ الفت بھی اک ضرورت تھی
ہم نے سوچا تو ہم بہت روئے

بڑھ گئی پیاس خشک پتّوں کی
ابر برسا تو ہم بہت روئے

اس کے چہرے پہ فرقتوں کا ملال
ہم نے دیکھا تو ہم بہت روئے

قیس پیتے رہے تو شاد رہے
نشہ ٹوٹا تو ہم بہت روئے

دور اس شہر بتاں سے آئی
یا کسی گوشۂ جاں سے آئی
میں اکیلا تو نہیں ہوں گھر میں
پھر یہ ویرانی کہاں سے آئی

وہ تو پھول کی ڈالی ہے
اپنا ہی دامن خالی ہے

جن کے ہاتھ نہیں ہوتے
ان کی آنکھ سوالی ہے

ہم جو اتنا روئے ہیں
ایک مصیبت ٹالی ہے

یارو اس کے جانے سے
گھر کیوں خالی خالی ہے

اپنے دل کی بات کہیں
ان کو بتانے والی ہے

گل میں رنگِ شفق ہے قیسؔ
یا پھر لب کی لالی ہے

دیکھ کر پھول کی ڈالی ہم نے
تری تصویر بنالی ہم نے

یہ تمنا کہ ترے ساتھ رہیں
بات سے بات نکالی ہم نے

وہ نہ آیا تو ہمیشہ کے لیے
گھر کو رہنے دیا خالی ہم نے

ترکِ الفت کو ضرورت سمجھا
اور تری بات نہ ٹالی ہم نے

یوں ترے درد کو آباد کیا
دل پہ دیوار اُٹھالی ہم نے

لے گئی گردشِ دوراں سب کچھ
اک تری یاد بچالی ہم نے

زندگی قیسؔ بہت پیاری تھی
پھر بھی سُولی پہ چڑھالی ہم نے

دل کو اک ربط تری ذات سے تھا
سلسلہ اپنی روایات سے تھا

اک شکایت ہمیں تقدیر سے تھی
اک گلہ اُن کی عنایات سے تھا

کس حوالے سے اُسے یاد کروں
وہ گریزاں جو ملاقات سے تھا

میں ہی تھا تجھ کو بھلانے والا
رنج دل کو مری اوقات سے تھا

اب تو رونا نہیں آتا ورنہ
عشق ان آنکھوں کو برسات سے تھا

زندگی کیسے کٹے گی اے قیسؔ
میں پریشان اسی بات سے تھا

رات جاگا ہوں تو سوچا کیا ہے
اب مری سوچ میں رکھا کیا ہے

یہ تمنا یہ گراں باری شوق
یا الٰہی تری دنیا کیا ہے

اس محبت کے تقاضے کیا ہیں
یہ ہمیشہ کا بچھڑنا کیا ہے

گردشیں کیوں ہیں ہر اک شے کا نصیب
اور یہ شام سویرا کیا ہے

ذہن کے ساتھ یہ یادیں کیوں ہیں
جسم کے ساتھ یہ سایا کیا ہے

دل ہے کس شخص کی خاطر بے تاب
اور آنکھوں میں یہ دریا کیا ہے

راہ میں چھوڑ گیا ہے وہ قیسؔ
جانے اس شخص نے سوچا کیا ہے

لگ گئی آنکھ میں جھڑی ایسی
ہم سے چھوٹی ہے وہ گلی ایسی

جل اُٹھا میں چراغِ شب کی طرح
آج کی شام کچھ ڈھلی ایسی

کوئی آیا نہ دستکیں دینے
گھر کی تقدیر ہی نہ تھی ایسی

پتہ پتہ بکھر گیا یارو
فرقتوں کی ہوا چلی ایسی

کیا سے کیا ہوگئی تمہارے بعد
پہلے دنیا کبھی نہ تھی ایسی

یوں جلا ہوں کہ کچھ بچا ہی نہیں
اب کے کچھ آگ ہی لگی ایسی

لمحہ لمحہ اداس ہیں آنکھیں
زندگی میں ہے کیا کمی ایسی

جز ترے کچھ نظر نہیں آتا
کس کے گھر میں ہے روشنی ایسی

ایک وہ شخص کیا گیا ہے قیسؔ
ساری ہستی اجڑ گئی ایسی

❁

چاروں طرف شیشے شیشے
کون اس کی صورت دیکھے

سورج سر پر آ پہنچا
دروازہ تکتے تکتے

اس کا گھر تو دور نہ تھا
ہم ہی رستہ بھول گئے

آنکھیں کب سے پیاسی ہیں
آج بہت رونا تھا مجھے

جانے کس کی یاد آئی
جل گیا میں سورج ڈھلتے

دنیا ہم کو بھول گئی
ہم دونوں ایسے بچھڑے

کون رفو کرتا یارو
زخم بہت ہی گہرے تھے

دیواریں ہی دیواریں
ہم نہ اس کو دیکھ سکے

میں تنہا اور منزل دور
کوئی میرے ساتھ چلے

دل دیوانہ ہے میرا
اپنے ڈھب کی بات کرے

وہ کب آ کر دیکھے گا
دل کے اجڑے ہوئے نقشے

اپنے جی کی ایک ہی سوچ
وہ اس شہر کو چھوڑ نہ دے

شیشے جیسا دل میرا
پتھر جیسے غم اس کے

میرے ساتھ مرا احساس
ساری ساری رات جلے

آج وہ اتنا یاد آیا
سو گئے ہم روتے - روتے

قیسؔ ان گلیوں کے باسی
جانے آج کہاں ہونگے

دیوارودر

سعید قیس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب
محمد افضل نجیب
کے نام

روشنی مجھ کو بلانے مرے گھر تک آئی
اُس نے دیوار پہ مٹی کا دیا کیا رکھا

فہرست

اپنی دیوار کا نوشتہ ہوں
اپنے ثابت کا بیش و کم ہوں میں
زندگی حرف حرف گزری ہے
اپنے اوراق میں رقم ہوں میں

قُربتوں اور ہجرتوں سے لذّت آشنا شاعر

سعید قیس

زندگی کے ہنگامے اور اِن ہنگاموں کے نتائج جہاں زیست کے مختلف رویّوں کو جنم دیتے ہیں وہیں شعر و ادب میں نئے رجحانات اور نئے اسالیب کی تخلیق کا سبب بھی بنتے ہیں۔ اِس طرح ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کو ساتھ لے کر چلتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا مفہوم واضح نہیں ہو سکتا تو شاید غلط نہ ہوگا۔ آج ادب میں نت نئے رجحانات اور اُن کی وسعتوں کا احاطہ کرنا، ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو رہا ہے اس کی وجہ انسانی زندگی کے وہ تغیرات ہیں جو کچھ تو ہماری توقع کے مطابق ہیں اور اکثر غیر متوقع حالات کی پیداوار ہیں۔ پچھلے بیس پچیس برسوں میں وطن عزیز کی سرزمین پر سیاست، معاشرت اور معیشت کے حوالے سے جتنے بھی بھونچال رونما ہوئے، اُن کی رُوداد اگر نہ بھی لکھی گئی ہو تو بھی ان کے اثرات اِس قدر گہرے، نمایاں اور دُوررس ہیں کہ اس عرصے میں تخلیق ہونے والا ادب اپنی پہنائیوں میں اس کو گونج اور اپنے ظاہری لبادے پر اس کی چھاپ رکھتا ہے۔ خاص طور پر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد پاکستان کی تباہ شدہ معیشت اور ڈگمگاتے سیاسی مستقبل نے قوم کے ہر فرد کی آنکھوں کے سامنے جو اندھیرے کاشت کیے اس نے وطن اور قوم کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

خطرے کے اس الارم کو ''آوازِ جرس'' میں بدلنے کے لیے قوم کے فرزندوں نے وطنِ عزیز کے لیے جسمانی قربتوں کو ہجر و فراق کے لمحوں بلکہ سالوں میں بدلنے کا پختہ عزم کر لیا اور یورپ کے برفانی موسموں کے علاوہ مڈل ایسٹ کے تپتے ہوئے صحراؤں اور ریگزاروں کو قسمت آزمائی کے لیے منتخب کر بیٹھے اُن کے پُر عزم حوصلے، نیک نیتی اور محنت شاقہ نے دنوں میں قوم کی معاشی حالت کو سہارا فراہم کر دیا۔ اس دوران جسمانی قربتوں کے فاصلے اگرچہ بڑھتے رہے لیکن روحانی قربتوں کے فاصلے روز بروز کم ہوتے گئے مگر جب بشری تقاضوں کے مطابق یہ روحانی قربتیں جسموں کو دُوری کے کرب سے ہمکنار ہوئیں تو روحوں میں ایک ہلچل سی مچ جانا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ پردیس میں دیس کی یاد، بیگانوں میں اپنوں کا خیال، ماں کی دُعا، بیوی کا ایثار، بہن کی بیتا، بیٹی کی حیاء، بیٹے کی وفا، بھائی کی قربانی، ہمسائے کا خلوص، اہل محلہ کا حُسنِ سلوک اور ہموطنوں کی چاہت سبھی کچھ زندگی کے تلخ گھونٹ بن کر رہ گیا۔ رُوح کو زخم زخم کر دینے والے ان واقعات و لمحات نے شعر و ادب میں اپنا ظہور جس طریقے سے کیا ہے اس کی نمائندگی کے لئے قیّس کے اس شعری مجموعہ کو میں بڑے فخر اور اعتماد کے پیش کر سکتا ہوں۔ قیّس عرب کے ریگزاروں میں زندگی رقم کرنے کا عزمِ پیہم رکھنے والے اُن فرزندانِ وطنِ عزیز کی قسمت بدلنے کا ارمان دل میں سجا کہ گھر سے نکلے تھے یہ لوگ وطن اور اہل وطن کی محبت کو سینے سے لگائے کن کربناک لمحوں سے دن رات گزارتے رہے ہیں اس کے لیے قیّس کے اس مجموعے میں یہ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

پَیروں کے زخم بن گئی صحرا کی گرم ریت
سایہ کسی درخت کا سر پر کوئی نہ تھا

دشت وصحرا کے تصور سے بھی میں واقف نہ تھا
میری وِیرانی مجھے گھر سے بُلا کر لے گئی

تیری یادوں سے شب ہجر سجانے والے
سو بھی جائیں تو ترا وِرد جگا دیتا ہے

قیسؔ جیسے جواں مرد ہجرت گزیدہ کیوں ہوئے اس کا سبب حالات کا وہ "حبس" کہ لوگ "لو" کی دُعا مانگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس موقع پر قیسؔ نے جب اپنی ذات کے اندر کے حوالے سے بھی سفر شروع کیا تو اُنہیں یہی نظر آیا۔

وہی اجاڑ محلے وہی اُداس کھنڈر
ہم اپنی ذات کے اندر سفر بھی کر آئے

کھنڈرات کی اُداسی اور محلوں کی اُجاڑ جب "حبس" کا رُوپ دھارنے لگے تو پھر یہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے:

اے پرندوں جہاں ہوا نہ چلے
ایسی بستی سے کوچ کر جانا

مگر انسان کا ضمیر زندہ ہو تو اُس کا اپنی بستی سے سفر کر جانا بالکل عارضی نوعیت کا ہوتا ہے وطن کی محبت اور مٹی کی خوشبو اُسے ہر جگہ معطر رکھتی ہے اور بالآخر اک نہ اک دن اپنی مٹی کی کشش اسے کھینچ لاتی ہے۔

مری مٹی سے میری آبرو ہے
ہر اک غنچہ ترو تازہ ہے میرا
ابھی آنگن میں تیری روشنی ہے

ابھی دیوار پر سایا ہے میرا
انہی کے ساتھ گزری ہے جوانی
در و دیوار سے رِشتا ہے میرا

پردیس کی بہاریں بھی خُوب ہوں گی مگر اپنے وطن کی بہار سے کم کم قیسؔ کہتے ہیں:

ایک منظر بھی تو منظر سا نہیں
پر میرے دیوار و در میں کیا نہیں

روشنی بھی اِک ضُرورت ہے مگر
جس میں ہم رہتے ہیں گھر ایسا نہیں

قیسؔ اس میلے میں وہ بچہ ہوں میں
جو کھلونے کے لیے روتا نہیں!

معاشی اُجالے کی کرنیں سمیٹنے کے لیے دربدر ہونے والے اس اُمید پر دیارِ غیر کی ٹھوکریں کھاتے رہے کہ اک نہ اک دن جب وطن کو پلٹیں گے تو اپنے لیے خوشیوں کے کچھ کھلونے اور روشنی کے کچھ چراغ ساتھ ہوں گے۔ اور اِن بے نُور روزنوں اور بے صدا دریچوں کی بہار پھر پلٹ آئے گی لیکن اُنہیں کیا معلوم تھا کہ آسمان کے ارادے ہی کچھ اور ہیں دیارِ غیر میں دولت کمانے والے ہاتھ واپسی پر اپنوں کا ہاتھ تھامنے اور اُنہیں اپنے بازوؤں میں لینے کی خواہش پر اپنی خوشیاں اور ضرورتیں قربان کرتے رہے خود نامساعد حالات کی بھٹی میں جلتے رہے کہ ان کے عزیز و اقارب ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے لُطف اندوز ہو سکیں۔ مگر یہ کیا! اِدھر تو ہوا کا رُخ ہی بدل گیا۔ جن رشتوں کی مضبوطی اور تقدس کی بحالی کے لیے ہجر و فراق کا

زہر پیا گیا۔ وہی مضبوط رشتے کچے دھاگے ثابت ہونے لگے۔ رشتوں کا تقدس بحال ہونے کی بجائے پامال ہوگیا۔ روپے پیسے کی چمک دمک نے آنکھیں اس قدر خیرہ کردیں کہ رشتوں کی پہچان خون خمیر کی بجائے دولت بن گئی بیگانوں اور اپنوں کی پہچان کے معیارات بدل گئے۔ شرافت اور دیانت کی بجائے امارت وجہ تفاخر ٹھہری دولت کے انبار، بڑی بڑی عمارتیں، لمبی لمبی گاڑیاں جب اعتماد کی بنیاد بن جائیں تو پھر حالات و آلات مل کر احساسِ مروت کو کچل ہی دیا کرتے ہیں۔ مگر یہ وہ سارا نقشہ تھا جو اُن ہاتھوں اور اُن آنکھوں سے اوجھل تھا جو اپنوں کے لیے پردیس میں روٹی اور روشنی اکھٹی کرنے میں مصروف تھے واپسی پر اچانک بدلتے ہوئے غیر متوقع حالات نے انہیں کیسی حیران گن کیفیت سے ہمکنار کیا۔ ملاحظہ کیجئے قیس کے ان اشعار میں:

دیوار و در کا دیکھیے نقشہ بدل گیا
مجھ سے سلوک ہی مرے گھر کا بدل گیا

کس کام کے وہ پیڑ جو ہم نے لگائے تھے
آنگن میں دھوپ آ گئی سایہ بدل گیا

لفظوں کے احترام کی رسمیں بھی اُٹھ گئیں
اسلوب ہی ہمارے ہنر کا بدل گیا

بادل مری زمین سے ہو کر گزر گئے
دریا بھی مجھ کو دیکھ کے رستہ بدل گیا

پردیس کیا گئے تھے ذرا دیر کے لیے
یہ کیا ہوا کہ شہر ہی سارا بدل گیا

ہجر و فراق کی چلچلاتی دھوپ میں جلنے والے جب محبتوں کے سحاب کی رم جھم کی خواہش لے کر گھر کو پلٹے تو اُن کی اُمید کا خون یوں ہوا:

آنکھوں نے یوں تو کیا نہیں رکھا تھا سوچ کر
ہم دیکھنے گئے تو تماشا بدل گیا

پہلی سی اُس گلی کی فضا بھی نہیں رہی
بس دیکھتے ہی دیکھتے کیا کیا بدل گیا

ایک صاحبِ دل کے لیے اس سے بڑا کرب اور کیا ہوگا کہ:

میلہ لگا تو دیکھنے نکلا میں شوق سے
جو رو رہا تھا مجھ میں وہ بچہ بدل گیا

ان بدلتی قدروں نے شاعر کو کس قدر دکھی کر دیا ہے اس کی مثال دیکھیے۔ یہ چند اشعار جن میں دیس پردیس دونوں موسموں کا تذکرہ ہے۔

نہ اُس کے قرب میں راحت نہ اس کی دوری میں
کسے بتاتے کہ جاں پر وبال ایسا تھا
وہ قیس پوچھنے آئے تھے رنجشوں کا سبب
جواب کیا انہیں دیتے سوال ایسا تھا

آرزو ایک پھول کی لے کر
وہ ہمارا شجر شجر جانا

ان حالات نے اپنوں کی بھیڑ کے درمیان ہوتے ہوئے بھی تنہائی اور حیرت کو جنم دیا۔ اگر چہ مُرجھائے ہوئے پھولوں پر نکھار تو آ چکا تھا۔ مگر خوشبو شاید دیارِ غیر کی طرف ہجرت کر چکی تھی اور اب یہ کاغذی پھول تھے جو پھول تو ہوتے ہیں مگر اپنے نہیں کیونکہ ان میں وہ ارتقاء نہیں ہوتا جو انسان اور پھول کی مشترکہ خصوصیت ہے۔ یہاں شاعر کی کیفیت تو اس باغبان جیسی ہے جس نے باغ میں گلاب کاشت کیا اور اپنے سُرخ خون سے آبیاری بھی کی ہو مگر پودوں پر جب پھول نمودار ہوں تو وہ سب کے سب کاغذی ہوں۔ اس موقع پر باغبان مجسمۂ حیرت نہیں تو اور وہ کیا ہو گا۔

رات کو دیر دیر تک جاگوں
گھر کے وِیران راستے دیکھوں
تیری یادوں کو بار بار گنوں
اپنی سوچوں کے دائرے دیکھوں
یہ سامان جو بکھرا بکھرا ہے گھر میں
قیسؔ یہ میرا اپنا ہی شیرازہ ہے

اس موقع پر ایک دردمند پاکستانی کو دیارِ غیر کی تمام ٹھوکریں بے سُود محسوس ہوتی ہیں:

چاندنی رات مجھے راس نہ آئی مولا
میرے کس کام کی یہ چیز پرائی مولا
کون لائے گا گلستانِ تمنا کی خبر
کون دے گا مجھے جنگل سے رہائی مولا

یہ شعر تو پڑھنے والے کا جگر کاٹ کر رکھ دیتا ہے جس میں گھر اور گھر والوں کا واضح فرق نظر آنے لگتا ہے:

بڑے خلوص سے ملتا ہے گھر کا سایہ مجھے
یہ کام وہ ہے جسے میرا گھر نہیں کرتا

مگر اس ساری صورتِ حال میں ایک بات شاعر کے لیے باعثِ اطمینان ہے اور وہ ہے وطن کی سرزمین سے والہانہ عشق اسے ہموطنوں کے بدلتے ہوئے رویّوں سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر وطن کی پُر کیف ہوائیں اور فضائیں اس کی سانسوں کو مُشک بار کیے رکھتی ہیں اِسی لیے قیّس وطن سے سینکڑوں میل دُور بیٹھے ہوئے بھی اس کے گلی کوچوں کی سیر کرتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ براہِ راست اور کبھی ذکرِ جاناں کے حوالے سے اپنی اس فطری محبت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

عظمت دیر و حرم اپنی جگہ
ہم کو تو اُس کی گلی اچھی لگی

ہر لمحہ مرے ہاتھ ہے خوشبو کے سفر میں
وہ شخص کسی رُت میں جدائی نہیں دیتا

دل میں اُس کا گھر بنایا اور قیّس
آنکھ کا رستہ کھُلا رکھا گیا

تیری سانسوں کی مہک آئے جہاں سے آئے
ہم نے دیوار میں ہر سمت دریچہ رکھا

دیوار میں ہر سمت دریچہ رکھنے کا صاف اور سیدھا مفہوم یہی ہے کہ ہمارا شاعر ''اقبال کی طرح اپنی ''کشتِ ویراں'' سے نا اُمید نہیں ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

سوچو تو زرخیز بہت ہے قیسؔ ہماری مٹی

قیسؔ کی شاعری میں نمایاں ہونے والی ان حقیقتوں سے صرف یہ نتیجہ اخذ کر لینا ہی مناسب نہ ہوگا کہ ان کی شاعری صرف ان حالات کی غمازی کرتی ہے جو پاکستان کی سیاست ومعیشت سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ اُن کی وطن سے محبت ''ملّت سے محبت'' کا رُوپ دھارتی ہے تو اُن کی فکر کے دائروں کے قطر وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ اُن کی سوچ پوری عرب دنیا اور عالمِ اسلام کو اپنا وطن سمجھنے کی متقاضی ہو جاتی ہے۔ ایران، عراق جنگ کے بعد عراق، کویت تصادم کے نتیجے میں امریکی سامراجی سائے عرب دُنیا پر کس طرح پاؤں جما رہے ہیں اور اس کے کیا نتائج برآمد ہونے والے ہیں یہ سوچ کر روحوں میں ایک لرزہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ قیسؔ کہتے ہیں:

آنگن آنگن آ بیٹھی ہے دھوپ لگا کر خیمے
سورج کے دکھ جھیل رہی ہے پھر دُکھیاری مٹی
دل گلشن میں غم کے بوٹے زخموں کے گلدستے
سوچو تو زرخیز بہت ہے قیسؔ ہماری مٹی

قیسؔ کا تعلق پنجاب (پاکستان) کی اُس مردم خیز دھرتی سے ہے جسے صوفیا کی دھرتی کہا جاتا ہے۔ جس کے ذرّے ذرّے میں حقیقت ومعروفت کی تخم ریزی ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی بھوری مٹی سے جنم لینے والا شاعر خواہ کسی زبان میں شاعری

کرے۔ وہ عملی طور پر صوفی ہو یا نہ ہو اس کی سوچ میں صوفیانہ خیالات کا در آنا ایک فطری عمل ہے اور جب یہی فطری عمل تخلیق کے مراحل سے گزرتا ہے تو ایسا موزوں کلام سامنے آتا ہے کہ جو پڑھنے والوں کو وجد آفریں کیفیتوں سے ہمکنار کر جاتا ہے۔ قیسؔ کے بارے میں میرا یہ دعویٰ تو نہیں کہ انہیں حقیقت و معرفت کا وہ گیان حاصل ہے جو ایک خدا رسیدہ صوفی کو ہوتا ہے۔ لیکن اُن کے کون ضمیر میں صوفیانہ سوچ کا موجود ہونا پنجاب کی مٹی کی دین ضرور ہے۔ انسانی تخلیق اور فلسفۂ زندگی سے متعلق ان کے فکر انگیز تصورات کی چند جھلکیاں ملاحظہ کیجئے۔

جو سامنے نہیں ہے وہی دیکھتا ہوں میں
خود اپنی ذات کے لئے اک مسئلہ ہوں میں

ہوگا کبھی تو ختم مری ہجرتوں کا سال
اے ہمنشیں ہمیشہ سفر میں رہا ہوں میں

اُس کی اماں میں ہوں تو بڑے حوصلے میں قیسؔ
جیسے بہت سنبھال کے رکھا ہوا ہوں میں

اِک شورِ بلاخیز ہے اس گنبد جاں میں
وہ مجھ کو پکارے تو سنائی نہیں دیتا

صحرا کی وسعتوں سے بڑا ڈر لگا مجھے
پھیلا جو میں تو اپنے ہی اندر سمٹ گیا

ورائے جاں بھی اک جہان اور ہے
ورائے جاں بھی میری جان دیکھیے

اپنے آپ کی تلاش اور پہچان کے کبھی نہ ختم ہونے والے طویل سفر کو قیسؔ نے اپنی ہی ایک غزل میں جس فلسفیانہ رنگ میں بیان کیا ہے اس سے ان کی جستجوئے شوق اور آرزوئے خود آگہی کا پتا ملتا ہے۔

کوئی نغمہ سرا ہے میں نہیں ہوں
جو مجھ میں بولتا ہے میں نہیں ہوں
جسے سن کر خفا ہیں آپ مجھ سے
وہ میرا واقعہ ہے میں نہیں ہوں
جسے میں سوچتا ہوں وہ نہیں ہے
جسے وہ چاہتا ہے میں نہیں ہوں
اسی کے رنگ میں سرو سمن میں
وہ پھولوں میں چھپا ہے میں نہیں ہوں
اِدھر کیوں دیکھتی ہے قیسؔ دنیا
وہ آئینہ نما ہے میں نہیں ہوں

تری جدائی کے غم زدہ نہیں کرتی
ترا وصال کے در بدر نہیں کرتا

کوئی مجھے مری حالت سے بے خبر کر دے
بڑا عذاب ہے ہر شے کی جستجو رکھنا

آنسوؤں سے دل کو دھونا چاہیے
ایک دن جی بھر کے رونا چاہیے

قیس کی شاعری جہاں ایک فکر انگیز شاعر کو ہمارے سامنے لاتی ہے وہاں اُنہیں اس کُہنہ مشق فنکار کی حیثیت سے بھی نمایاں کرتی ہے جسے رموزِ شعروسخن سے خوب خوب آشنائی ہے اور جو ایک عرصہ تک دشتِ خیال میں صحرنورد کے روپ میں کچھ تلاش کرتا رہا ہے۔ اِس صحرانوردی میں اسے بحور اور فن شعر سے متعلق جو واقفیت کے جوہر تابدار ہاتھ لگے ہیں اسے وہ فنی اصول بنا کر یوں پیش کرتا ہے۔

وہ پھول کیا ہے جو خوشبو سے بھی رہے عاری
وہ شعر کیا ہے جو دِل پر اثر نہیں کرتا

زخم ترتیب سے رکھ دینا غزل ہے اے قیسؔ
شعر کہنا تو ہے بس خون اُگلتے رہنا

اس کے ہونٹوں پہ مسرت کی لکیر
فن کا معیار بنا دی جائے

قیسؔ بحر خفیف میں تھی غزل
ہم کو یہ بھی خیال رکھنا تھا

فن کی باریکیوں پر جہاں قیسؔ کی گہری نظر ہے وہاں زندگی کا گہرا فلسفہ بھی ان کی غزل کی پہچان بنا ہے:

ہم اپنی ذات کی تکمیل میں رہے مصروف
ذرا سی بات نے برسوں ملال میں رکھا

❁

پتھر اسے ماریں تو گلہ بھی نہیں کرتا
جو ظرف بھرا ہو وہ صدا بھی نہیں کرتا

❁

وہ ایک شخص بہت ہی عزیز ہے اے قیسؔ
جو چھپ کے بیٹھا ہے مجھ میں مری انا کی طرح

❁

آہستہ آہستہ محبت بن جاتے ہیں
ملتے ہیں تو لوگ ضرورت بن جاتے ہیں

❁

روشنی تو ضرور آتی ہے
کوئی روزن نکال رکھنا تھا

❁

یہی تو وصف ہے ہم نامراد لوگوں کا
زمیں پہ رہنا نظر آسمان میں رکھنا

فراغِ زخم سے ہم نے یہی تو سیکھا ہے
لہو کا ذائقہ اپنی زبان میں رکھنا

جی سکتے ہو قیسؔ تو جی لو
مرجانا آسان بہت ہے

سہل ممتنع کی چند ایک مثالیں دیکھیے:

اُن کی صورت بھی چاند جیسی ہے
اپنی نیت بھی چاند جیسی ہے

آستیں کا نصیب تھا ورنہ
سانپ کس نے خوشی سے پالے ہیں

یوں تو سارے خوش رہتے ہیں
سب کو روگ لگا ہوتا ہے

ہر دل کے مقدّر میں محبت نہیں ہوتی
ہر شخص سے ہر شخص وفا بھی نہیں کرتا

قیسؔ کی شاعرانہ عظمت کی ایک دلیل ان کی خوبصورت اور دلکش اصطلاحات ہیں جو اُردو شاعری میں یقیناً اضافہ تصور ہوں گی۔ یوں تو اس پورے شعری مجموعے میں رنگارنگ اصطلاحات کی بہار کھلی ہوئی ہے۔ مگر یہاں صرف چند مثالوں پر ہی اکتفا کیا جارہا ہے:

خمار دیتا مجھے اور مست کر دیتا
وہ چاہتا تو مجھے سبز بخت کر دیتا

یہ جو پیاس کے بادل اُڑتے پھرتے ہیں
پچھلی رُت کی بارش کا خمیازہ ہے

عجیب برزخِ ہجر و وصال میں رکھا
رہائی دے کے مجھے اس نے جال میں رکھا

غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل کائنات ہوتا ہے اور جب کسی ایک احساس کی غزل ہو جائے تو یوں سمجھیے کہ ایک کائنات میں کئی جہاں آباد ہو گئے ہیں۔ قیسؔ کی چند ایک غزلوں میں یہ خوبی بڑی نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے بلکہ ان غزلوں میں تو نظم کی کیفیت نے جنم لے رکھا ہے۔ دیکھیے یہ شعر:

فرض کرو ہم جینا چاہیں اور جینا بیکار سا ہو
فرض کرو کہ مر جانا بھی اپنے لیے دشوار سا ہو
فرض کرو کہ اس کی باتیں دل کو دکھانے والی ہوں
فرض کرو کہ اس کا لہجہ لکڑی کی تلوار سا ہو
فرض کرو کہ بیٹھے بیٹھے ہم یہ سوچ رہے ہوں قیسؔ
چاہے ایک شجر ہو گھر میں لیکن سایہ دار سا ہو

لکھنے والو جو بھی لکھنا نام ہوا کے لکھنا
سچی باتیں اپنی ذات سے باہر آ کے لکھنا

ہجر کی شب کی پہلی بارش وصل کی پہلی شبنم
قطرہ قطرہ سارے موسم شہرِ وفا کے لکھنا

یہ کہہ لیجئے کہ غزل کا تغزّل اور نظم اور گیت کی نغمگی کو قیسؔ نے اپنی غزل میں یکجا کر کے نئے اسلوب کے چراغ روشن کیے ہیں۔ ان کا یہ اسلوب اپنے ہمعصروں میں منفرد بھی ہے اور دلکش بھی اس کی چند مثالیں دیکھئے:

بہت وِیران کر جاتا ہے مجھ کو
پرندوں کا درختوں پر نہ ہونا

قیسؔ جن کو کھا گیا قد کا ملال
ان درختوں پر ثمر کیا دیکھتے

عزم رکھے تو چٹانوں کے سروں پر رکھے
زخم رکھا تو سمندر سے بھی گہرا رکھا

ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے لیکن
ہماری آرزو کتنی بڑی ہے

بری عادت ہے لیکن پڑ گئی ہے
خود اپنے گھر میں رہ کر گھر نہ ہونا

وہ بھی کرتا ہے خدا کی باتیں
ڈر نہیں جس کو خدا کا بابا

❁

لے گئے دکھ خرید کر اُس کو
اِک کھلونا مری دکان میں تھا

دیارِ وطن سے دُور بیٹھے قیسؔ اور اُن جیسے دیگر شعراء کی غزل دیکھ کر اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ ریگزاروں کی جُھلسا دینے والی لُو میں غزل کا کومل پودا پوری طرح سرسبز و شاداب ہے اور یوں اُردو غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں ان شعراء کا بھی اُتنا ہی حصہ ہے جتنا مقامی شعراء کا۔

دیارِ وطن سے دُور بیٹھا شاعر اپنی اس جواں نسل کے لیے کس قدر پریشان ہے اور درد مند دل رکھتا ہے جو وہیں پل کر جوان ہوئی ہے۔ اسے ہر ہر لمحہ یہ فکر لاحق ہے کہ یہ نسل پاکستان کا سرمایہ ہے۔ اس کی ذہنی تربیت ایسے خطوط پر ہونی چاہیے جس میں اپنی مٹی کی بُو باس اور اپنے تمدّن کی نمو نظر آئے۔ وطن کی محبت کے حوالے سے وہ نئی نسل سے یوں گویا ہوتے ہیں:

ان ہواؤں سے رابطے رکھنا
یہ دریچے یہ دَر کُھلے رکھنا

❁

کسی چراغ کی لَو تم بھی ساتھ لے جانا
اگر تمہیں بھی سفر اختیار کرنا ہے

❁

عجیب شوق مجھے شہر کے سفر کا ہے
پسِ خیال کوئی خواب بام و در کا ہے

بام ودر کا خیال ہی تو انہیں ہجر سے وصال کی لذّت تک کھنچے چلے آنے پر مجبور کیے جاتا ہے۔ یہی تعمیری سوچ اور فکر ہے کہ ہر صورت شہر وفا کو پلٹ آنا ہے قیسؔ کی شاعری میں زخم، پتھر، چاند، دھوپ، شب ہجر، در، دیوار، دریچہ اور روزن جیسے خاص الفاظ درحقیقت ایک خاص تہذیب وتمدّن اور اس کے پس منظر کی گواہی ہیں اور اس بچی گواہی پر اُن کا رشتہ دیارِ وطن سے دُور رہتے ہوئے بھی دیارِ وطن سے قریب تر کا ہے اور یہ پہچان میرے نزدیک کوئی چھوٹی پہچان نہیں کہ قربتوں کو ہجرتوں سے لذت آشنا کرنے کے بعد انہیں پھر قربتوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ کوشش قیسؔ ہی کا حصہ ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر عصمتُ اللہ زاہد

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

عیدالفطر ۱۴ مارچ ۱۹۹۴ء

سعید قیسؔ...... ''اپنے اوراق میں رقم ہوں میں''

شخصیت اور فن

نام محمد سعید، تخلص قیسؔ، ۲۸ مئی ۱۹۲۷ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ وہیں ایف، اے تک تعلیم حاصل کی۔ ملازمت کے سلسلے میں پہلے سعودی عرب اور ۱۹۸۰ء سے بحرین مقیم ہیں ۱۹۵۰ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ غزل پسندیدہ صنف ہے۔ دو مجموعے ''حدیثِ غم'' (۱۹۶۲ء) اور ''ہجر کے موسم'' (۱۹۸۰ء) شائع ہو چکے ہیں۔ موجودہ دیوان ''دیوار و در'' ان کی گزشتہ تیرہ سالہ فکرِ سخن پر مبنی ہے۔ اور اس میں غزلوں کے علاوہ حمد، نعت اور قطعات وغیرہ شامل ہیں۔

کہتے ہیں کہ حقیقی شاعری وہ ہے جو دل سے نکلے اور سیدھی دل میں اتر جائے اور قیسؔ کی شاعری ایسی ہی ہے۔ یہ حقیقی واردات قلب، زندگی کے تاثرات اور احساسات کی عکاس ہے اور سادگی، اثر آفرینی اور سوز و گداز اس کا خاصہ، بیشتر کلام عاشقانہ ہے۔ رنجوں، شکستوں اور محرمیوں سے مملو۔ جسے پڑھتے ہوئے دل بھر آتا ہے اور ذہن میں بے اختیار ایک ایسے شخص کا ہیولیٰ اُبھرتا ہے جس کو زندگی نے بجز محرومی اور تشنہ لبی کے کچھ نہیں دیا۔

قیسؔ اور اُن کی شاعری درحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ وہ سراپا الم ہیں اور یہی رنگ اُن کے کلام کا ہے۔ سادگی اور اخلاص اُن کا شیوہ ہے لہٰذا خیالات اور جذبات کی سچائیاں بھی سادگی سے بیان کرتے ہیں۔ بناوٹ نہ اُن کی زندگی میں ہے نہ شاعری میں وہ جیسے ہیں بعینہٖ نظر آتے ہیں۔

گورے چٹے، کشادہ پیشانی، آنکھوں پر سیاہ فریم کی عینک، چھریرے بدن اور عامیانہ قد وقامت کے مالک سعید قیسؔ سادگی اور انکسار کا پیکر ہیں۔ سلک کا کرتا اور سفید پاجامہ ان کا روزمرہ کا لباس نام ونمود اور گروپ بندی سے گریزاں۔ اپنی ہی دُھن میں مگن، خلوت پسند اور کم سخن دوست دشمن سب کے لیے دُعا گو۔ ایسے وضعدار کہ محبوب کو کبھی بے وفا نہیں کہا۔ گفتگو خواہ اجنبی سے ہو یا شناسا سے بہت نرمی سے بولتے اور اپنائیت سے پیش آتے باتوں باتوں میں بڑے علمی نکات بیان کرتے ہیں۔ بہت وسیع المطالعہ ہیں۔ کئی بڑے شاعروں سے ذاتی تعلقات ہیں۔ اکثر مشاہیر کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہو کر داد وتحسین پا چکے ہیں۔ پھر بھی خود کو نمایاں کرنے یا اپنی قابلیت کا رعب جمانے کا کوئی جذبہ ان میں نہیں۔ رسالوں میں بھی شاذ ونادر ہی اُن کا کلام دکھائی دیتا ہے۔ بیاض رکھنے کے قطعی قائل نہیں، یونہی پرزوں پر اشعار لکھتے جاتے ہیں بہت سا کلام اسی وجہ سے ضائع ہوا۔ بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ سابقہ مجموعوں کے مسودے۔ بلکہ ''حدیثِ غم'' کا تو نسخہ تک پاس نہیں مشاعروں میں بھی بہت کم شریک ہوتے ہیں لیکن جب پڑھنے بیٹھتے ہیں تو مجمع ازخود اُن کے ساتھ ہو لیتا ہے اور وہی کچھ دیکھتا، برتتا اور محسوس کرتا ہے جو شاعر کا اپنا مشاہدہ، تجربہ اور احساس ہے شاعری میں یہ بہالے جانے والی صنف جگر کو خون کرنے اور زمانہ بھر کی تلخیوں کا زہر سمیٹ لینے کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے اور قیسؔ نے تو جو بھی لکھا جذبہ کی صداقت کے ساتھ اور خونِ دل میں اُنگلیاں ڈبو کر ہی لکھا فرماتے ہیں۔

زخم کھایا ہے تو روتے کیوں نہیں
پاؤں میں چبھتی نہیں زنجیر کیا

قیسؔ جگر کا خون بھی شامل کر لینا شعروں میں
کشتِ غزل میں رنگ برنگے پھول کھلا کے لکھنا

زخم ترتیب سے رکھ دینا غزل ہے اے قیسؔ
شعر کہنا تو ہے بس خون اُگلتے رہنا

اب اگران کا ہر شعر دردِ دل کی تصویر معلوم ہوتا ہے یا وہ تنہا اور دل گرفتہ دکھائی دیتے ہیں تو آپ اسے اُفتادِ طبع کہہ لیں۔

قیسؔ ہی رکھ لیا جب اپنا تخلص ہم نے — کُنج آغوش میں اک دامنِ صحرا رکھا
میں اپنے خون کی لالی سے سرخرو ہوں بہت — مرے مزاج میں شامل ہے رنگ و بُو رکھنا

حالات و تجربات کی دین:

زندگی بے مہریوں نے چاٹ لی — چاہتوں کے سلسلے زَر کھا گیا
قیسؔ ہم تعمیرِ دل کرتے رہے — غم ہمیں اندر ہی اندر کھا گیا

انا کا مسئلہ:

میں صحرا ہوں مگر پیاسا نہیں قیسؔ — مرے پہلو میں اِک دریا ہے میرا

یا پھر اس آزار کا شاخسانہ جو اُن کے اندر ہے اور ہمہ وقت شہرِ آرزو کے سفر پر اُکساتا رہتا ہے۔

بڑا ہی شوق مجھے شہر کے سفر کا ہے — پسِ خیال کوئی خواب بام و در کا ہے

یہ خوابِ بام و در ہی اصل میں اُن کے دکھ کا منبع ہے۔ ہالہ کی طرح جس نے ان کو مُحیط کیا ہوا ہے۔ جو اُن کے اندر لہجہ اور کلام میں پرتوفگن ہے جسے وہ خود کربِ عاشقی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ع ''لذت دائم ہے کربِ عاشقی۔'' اور جس کے گرد اُن کی

غزل کا منظر نامہ ترتیب پاتا ہے۔

غزل کے رمزیہ اور علامتی پیرایہ میں قیسؔ اپنے خیالات، تجربات، مشاہدات اور احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں اظہارِ ذات کے علاوہ بے پایاں احساس تنہائی اور شدید غم والم کا تاثر ملتا ہے۔ تمام غزلوں میں محبت کی خلش ہے۔ بیشتر کو مربوط اور مسلسل کہا جاسکتا ہے اور یہ اُس زندگی کا نوحہ معلوم ہوتی ہیں جو بے فیض چاہت اور بے ثمر سعی سے عبارت ہے۔

غزل کا مرکزی خیال وہ چہرہ ہے جس کی جھلک دریچہ میں دیکھی تھی اور جو دُنیا کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔ اس سانحہ نے شاعر کی زندگی کا احاطہ یوں کیا کہ نہ وہ اُس لمحہ کے طِلسم سے آزاد ہوسکا اور نہ ہی جس کی تلاش تھی اُسے پاسکا۔ نتیجہ مایوسی، تنہائی، دُروں بینی اور نستالجیا (Nastalgia) یہ سب کیفیات اور رومانی اتار چڑھاؤں غزل کی ٹپسٹری (Tapestry) میں نظر آتے ہیں۔

اک دن اس کو دیکھ لیا تھا کھڑکی میں
تب سے ہر دیوار میں اِک دَر لگتا ہے

پھر اُس کے بعد کوئی حادثہ نہیں گزرا
بچھڑ گیا ہے تو دل کو ملال ایسا تھا

تمام عمر لکیروں میں ہوگئی تقسیم
وہ ایک نقش مرے ذہن میں اتار گیا

وہیں مل جائیں گے ہم اس کو تری یاد کے ساتھ
دشتِ غربت میں چلی آئے بلا سے کہنا

کوئی آتا نہیں دروازے پہ دستک دینے
اِس طرف سے بھی گزر جائے ہوا سے کہنا

شاید میں اپنے کرب کے اندر مقیم ہوں
شاید ترے خیال سے چھپتا رہا ہوں میں

آتا ہے خوف خود مجھے اپنے وجود سے
یہ کس بلا کے جنگلوں کا راستہ ہوں میں

ہر لمحہ مرے ساتھ ہے خوشبو کے سفر میں
وہ شخص کسی رت میں جدائی نہیں دیتا

نہ اس کے قرب میں راحت نہ اسکی دُوری میں
کسے بتائیں کہ جاں پر وبال ایسا تھا

خود ہی تجھ کو بھلا کے بیٹھ رہوں
خود ہی پھر دل کے حوصلے دیکھوں

کوئی آجائے کہیں سے اے قیسؔ
مجھ کو اس دکھ سے چھڑا لے جائے

فرض کرو ہم جینا چاہیں اور جینا بے کار سا ہو
فرض کرو کہ مر جانا بھی اپنے لیے دشوار سا ہو

اب نہ دل ہے نہ تمنا دل کی
اب ہمیں رنجِ طلب کیا ہوگا

وہ جو خوابوں کا نگر تھا کیا ہوا
اس گلی میں ایک گھر تھا کیا ہوا

کیا ہوئی جو سامنے کی بات تھی
جو پسِ دیوار و دَر تھا کیا ہوا

چلمنوں کی سرسراہٹ کیا ہوئی
نقش جو دیوار پر تھا کیا ہوا

اک طلب دائم حضورِ حُسن میں
اک دِل دریوزہ گر تھا کیا ہوا

قیسؔ تمثال کاری کے ماہر ہیں اور تشبیہوں، اِستعاروں، اشاروں اور کنایوں کے ذریعے بڑے واضح منظر اور پس منظر تخلیق کرتے ہیں۔ مانوس جگہیں جنہیں پیچھے چھوڑ آئے لوگ جو کبھی عزیز تھے۔ خواب جو ادھورے ہی رہے۔ آرزو کی کسک، محرومی و رنجوری کا الم، تنہائی کا کرب، صورتحال کی ناقابل برداشت اذّیت، عزیزوں کی بے رُخی۔ ہر خیال مثالیہ کی صُورت سامنے آتا ہے۔

روشنی مجھ کو بلانے مرے گھر تک آئی
اس نے دیوار پہ مٹی کا دیا کیا رکھا

یہاں تھا وہ تو دریچے بھی بولتے تھے بہت
چلا گیا ہے تو دیوار و دَر سے ڈر آئے

وہی اجاڑ محلے وہی اداس کھنڈر
ہم اپنی ذات کے اندر سفر بھی کر آئے

اس دل کی دعاؤں کے اثر کو نہیں دیکھا
جب پیڑ لگائے تو ثمر کو نہیں دیکھا

ہم بیاباں اپنی تنہائی کا تھے
دل میں جنگل تھا گھر کیا دیکھتے

بادل مری زمین سے ہو کر گزر گئے
دریا بھی مجھ کو دیکھ کے رستہ بدل گیا

بڑے خلوص سے ملتا ہے گھر کا سایہ مجھے
یہ کام وہ ہے جسے میرا گھر نہیں کرتا

دیوار و در کی مرکزی علامت سمیت تمام استعارات، مکان، گھر، جنگل،

بیاباں، دشت، صحرا، بادل، دریا، سمندر، شجر، ثمر، دیا، سفر، کھنڈر، پرند وغیرہ ہم میں وہی یاسیت موجزن ہے جو قیسؔ کی شخصیت کا جزو ہے۔

قیسؔ کی شعری لغت اور لب ولہجہ بہت سادہ لیکن مؤثر ہے۔ بات سامنے کی ہو، عمیق یا فلسفیانہ، عام فہم زبان میں کہتے ہیں۔

اور دنیا میں کسی کا کیا گیا
ہم ہی تنہا رہ گئے ان کے بغیر

دل کو تو بس اک کھلونا چاہیے
زخم فرقت ہو کہ داغ آرزو

داغ سا پڑ گیا ہے سینے میں
جب سے ہم نے چراغ مانگا ہے

پانی میں ہو بہو ترا چہرہ لگا مجھے
ندی میں چاند پھینک دیا تھا کسی نے قیسؔ

پرانی تشبیہات کے ساتھ انہوں نے برزخِ ہجر و وصال، شہر جاں، شہرِ طلسمِ نظر اور جشنِ آستیں وغیرہ نئی لفظیات کو بھی بڑی خوبصورتی سے برتا ہے تاہم کہیں کہیں کھری حقیقت نگاری (......بلوں کو لوٹ رہی ہیں چیونٹیاں، ...... چیونٹیوں کا پر نکالنا) اور مانوس ترکیبوں کے غیر مروّجہ انداز میں استعمال (شباب سانپ کی طرح گزر گیا۔ اب بیٹھ کے نشان دیکھیے) کے سبب لہجہ عجیب اور غیر شاعرانہ ہوگیا ہے۔

قیسؔ کے اوّلین مجموعۂ کلام ''حدیثِ غم'' اور موجودہ دیوان ''دیوار و در'' کے مابین کم و بیش تیس سال کا وقفہ حائل ہے۔ شاعری کا مجموعی مزاج اگرچہ ان کے ابتدائی دعوے ع ''جب مگر تمنا ہے تو ماتم بھی رہے گا'' کے مطابق ہی ہے پھر بھی مطالعہ کے دوران شاعرِ کے ذہنی، فکری اور قلبی روّیہ میں تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ حمد، نعتیہ اشعار، سائیں بابا کی موجودگی اور دیگر دینی اشارے مذہب کی طرف جھکاؤ کے غمّاز ہیں۔ اس کے علاوہ اب وہ محض ذاتی رنجوں اور کلفتوں ہی کو موضوع نہیں بناتے، بلکہ عصر حاضر کے مسائل بھی اپنے مخصوص رنگ میں بیان کرتے ہیں۔

آئینے اندھے اُٹھا کر لے گئے — آنکھ والے بے خبر بیٹھے رہے
یہ ریا کاریوں کا دَور ہے قیسؔ — اہلِ دل کی کرامتیں، بھی گئیں
خواب ہی کوئی نہ تھا شاید کسی آنکھ میں — شہر والے اس لئے آرام سے سوتے رہے
نوچ کر چڑیوں کے پَر بھی لے گئے — سبز شاخوں سے ثمر بھی لے گئے
اب کے اتنے مہرباں تھے ہم سفر — چادروں کے ساتھ سَر بھی لے گئے

لیکن سب سے بڑی تبدیلی قیسؔ کی شخصی جذباتی کیفیت میں آئی ہے جس کا اندازہ شعری منظر پہ طاری واماندگی اور اضمحلال سے ہوتا ہے۔ یادوں کے جنگل میں بھٹکتے ہوئے لگتا ہے۔ شاعر بوڑھا اور تھک کر چور ہو چکا ہے۔ اب اُسے کوئی بشارت خوش نہیں کرسکتی نہ کوئی صدمہ مزید دُکھ پہنچا سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مہلتِ عمر کم ہے جس کے اتمام کے ساتھ ہی دل کا بوجھ بھی اُتر جائے گا۔

سفر کا آخر شب ہم ارادہ قیسؔ کیا کرتے — وہ سارے قافلے ہی لٹ گئے آہستہ آہستہ

یہی اختتامیہ ہے دیوان کا اور شاید اس خوابِ بام و در کا بھی جسے شاعر نے حرز جاں بنا رکھا ہے۔

ثروت آرا
(بحرین)

میرے شعروں کا بھرم تیرا ہے
ہاتھ میرے ہیں قلم تیرا ہے

ہر بن مو میں تری خوشبوئیں
ہر سرِ زلف میں خم تیرا ہے

آئینے میں ہے ترا عکسِ جمال
نقش ہر دل پہ رقم تیرا ہے

یہ مرے گوہرِ ارزاں تیرے
یہ مرا دیدۂ نم تیرا ہے

تیری تخلیق کا پیکر مَیں ہوں
میرے پندار کا غم تیرا ہے

مَیں تو بس حُسنِ کرم دیکھتا ہوں
یہ زیادہ ہو کہ کم تیرا ہے

خانۂ دل میں ترے جلوے ہیں
میری آنکھوں پہ قدم تیرا ہے

زندگی عرصۂ بے نام ہے قیسؔ
جی رہے ہیں یہ کرم تیرا ہے

چاندنی رات مجھے راس نہ آئی مولا
میرے کِس کام کی یہ چیز پرائی مولا

یہ مرا جبرِ سماعت میری رُسوائی ہے
اَب مجھے کچھ نہیں دیتا ہے سُنائی مولا

کوئی خوشبو نہیں آتی مرے اندر سے مُجھے
ابھی زخموں پہ جوانی نہیں آئی مولا

تُو نے جس دشت میں رکھا مجھے سائے کے بغیر
خُوب میں نے بھی وہاں خاک اُڑائی مولا

دے بشارت کسی قربت کے حوالے سے مُجھے
اب سہی جاتی نہیں مُجھ سے جُدائی مولا

لُوٹ لیتا ہے مجھے کوئی سحر سے پہلے
چھین لیتا ہے مری ساری کمائی مولا

کون لائے گا گلستانِ تمنا کی خبر
کون دے گا مجھے جنگل سے رہائی مولا

میرے احوال پہ تو بھی تو نظر رکھتا ہے
دَر و دیوار پہ اُگنے لگی کائی مولا

جس کی لَو سے ہوں مرے دِیدہ و دل بھی روشن
تُو نے وہ شمع کہاں جا کے جلائی مولا

بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی اب تک
میں نے وہ بات کِسی کو نہ بتائی مولا

مُجھے ورثے کی طلب ہے نہ عطا کی حاجت
کوئی سُنتا ہی نہیں میری دُہائی مولا

معجزہ قیس مِری آگ کے اندر تھا نہاں
جَل گیا مَیں تو اُسے آنچ نہ آئی مولا

نارساؤں کے لیے دستِ رَسا بھیجتا ہے
رِزق پتھر میں بھی کیڑے کو خُدا بھیجتا ہے

عام کر دیتا ہے صحراؤں میں چشموں کا وجُود
خشک پتوں کے لئے نرم ہوا بھیجتا ہے

دلِ بُلبُل میں جگاتا ہے محبّت کا شعورُ
پھر اُسے پھُول کی خوشبُو کا پتا بھیجتا ہے

روشنی چاند نہ لائے تو وہی غیب کا ہاتھ
شبِ تاریک میں جگنو سا دِیا بھیجتا ہے

دَر گزر کرتا ہے بندوں کو بہ ہنگامِ خطا
اور ماؤں کے لیے حرفِ دُعا بھیجتا ہے

دولتِ دَرد سے بھر دِیتا ہے کاسہ دل کا
گُبندِ جاں سے مُجھے سچ کا صَدا بھیجتا ہے

یاد رِکھتا ہے سدا قیسؔ مُجھے میرا خُدا
جو مُجھے میری طلب سے بھی سوا بھیجتا ہے

❁

رُوئے زمیں پہ شانِ رسالت رسولِ پاکؐ
بابِ پیمبری کی نہایت رسولِ پاکؐ

احساسِ جاں میں لذّتِ ادراک و آگہی
خوابِ گراں میں صرفِ بشارت رسولِ پاکؐ

قلب و نظر میں نقشِ ہدایت کا اعتبار
اقلیمِ جاں میں مُہرِ نبوّت رسولِ پاکؐ

قلب و نظر میں نقشِ ہدایت کا اعتبار
اقلیمِ جاں میں مُہرِ نبوّت رسولِ پاکؐ

آسانیوں میں راحتِ جاں رہنمائے کُل
اور مُشکلوں میں سب کی ضُرورت رسولِ پاکؐ

اُن کی سخاوتوں کے ہیں چرچے جہان میں
اَوجِ کرم کمالِ مُروّت رسولِ پاکؐ

ہے آپ ہی کے نُورِ بصیرت سے روشنی
دِل کو رہے گی آپؐ سے نسبت رسولِ پاکؐ

اوجھل ہے پھر نظر سے مقامِ زیاں وسُود
گم کر گئی ہے پھر مجھے وحشت رسُولِ پاکؐ

عاصی ہوں کھول دیجئے گا بابِ مغفرت
ہیں آپؐ ہی تو مالکِ جنّت رسولِ پاکؐ

صد حوصلے ہیں قیسؔ مُجھے اُن کی ذات سے
روزِ جزا کریں گے حمایت رسولِ پاکؐ

کوئی دِیوار کوئی دَر نہ ہوتا
اِن آنکھوں میں کوئی منظر نہ ہوتا

بہت ویران کر جاتا ہے مُجھ کو
پرندوں کا درختوں پر نہ ہوتا

سبب یہ بھی ہے اپنی بے حسی کا
رگِ جاں میں کوئی نشتر نہ ہوتا

بُری عادت ہے لیکن پڑگئی ہے
خود اپنے گھر میں رہ کر گھر نہ ہوتا

تم اپنے بوجھ ہی سے دَب نہ جاؤ
کبھیں اتنے بھی طاقتور نہ ہوتا

کبھی یادوں کے جنگل میں نہ جانا
کسی آواز پر پتھر نہ ہوتا

دلوں کو قیسؔ بنجر کر گیا ہے
ہماری سوچ کا محور نہ ہوتا

دِل کو سیراب کیا اور نہ پیاسا رکھا
ہم نے دریا سے عجب جبر کا رشتہ رکھا

شوق تو اُس کو بھی تھا بھیڑ میں کھو جانے کا
جانے کیا سوچ کے اُس نے مُجھے تنہا رکھا

تیری سانسوں کی مہک آئے جہاں سے آئے
ہم نے دیوار میں ہر سمت دریچہ رکھا

عزم رکھے تو چٹانوں کے سَروں پر رکھے
زخم رکھا تو سمندر سے بھی گہرا رکھا

جس کی گہرائی میں ہم ڈوب سکیں مر بھی سکیں
ہم نے آنکھوں میں وہ دریا تو ہمیشہ رکھا

دل کو رکھا تری یادوں کی نگہبانی میں
اور آنکھوں پہ تری دید کا پہرا رکھا

آرزوؤں کے گھروندے بھی بنائے ہم نے
ذہن میں خوف بھی ہر آن ہوا کا رکھا

یہ بجا دُودھ کی نہریں یہ بہائیں ہم نے
یہ کہو ہاتھ سے کب ہم نے یہ تیشہ رکھا

روشنی مجھ کو بُلانے مِرے گھر تک آئی
اُس نے دیوار پہ مٹی کا دیا کیا رکھا

قیسؔ ہی رکھ لیا جب اپنا تخلّص ہم نے
کُنجِ آغوش میں اک دامنِ صحرا رکھا

دیوار و دَر کا دیکھیے نقشہ بدل گیا
مجھ سے سلُوک ہی میرے گھر کا بدل گیا

کس کام کے وہ پیڑ جو ہم نے لگائے تھے
آنگن میں دُھوپ آ گئی سایہ بدل گیا

لفظوں کے احترام کی رَسمیں بھی اُٹھ گئیں
اسلُوب ہی ہمارے ہنر کا بدل گیا

بادل مری زمین سے ہو کر گزر گئے
دریا بھی مجھ کو دیکھ کے رَستہ بدل گیا

یہ کس بلا کا خوف تھا میرے وجود میں
آئینہ دیکھ کر مرا چہرہ بدل گیا

پردیس کیا گئے تھے ذرا دیر کے لیے
یہ کیا ہوا کہ شہر ہی سارا بدل گیا

آنکھوں نے یوں تو کیا نہیں رکھا تھا سوچ کر
ہم دیکھنے گئے تو تماشا بدل گیا

پہلی سی اُس گلی کی فضا بھی نہیں رہی
بس دیکھتے ہی دیکھتے کیا کیا بدل گیا

میلہ لگا تو دیکھنے نکلا مَیں شوق سے
جو رو رہا تھا مجھ میں وہ بچہ بدل گیا

جلنا مجھے قبول تھا جس میں ہزار بار
وہ آگ بُجھ گئی ہے کہ شُعلہ بدل گیا

تعمیرِ دل ہی ان دونوں پیشِ نظر تھی قیسؔ
یوں اپنے سوچنے کا طریقہ بدل گیا

منظرِ دل پیشتر کیا دیکھتے
اِس عمارت کے کھنڈر کیا دیکھتے

شب گزیدہ تھے اِن آنکھوں کے چراغ
چاند کا لمبا سفر کیا دیکھتے

جانتے تھے ہم وہاں کوئی نہیں
پھر پسِ دیوار و دَر کیا دیکھتے

ہم بیاباں اپنی تنہائی کا تھے
دل میں جنگل تھا تو گھر کیا دیکھتے

وہ تو اپنے آب و گِل میں نُور تھا
ہم اُسے اے کُوزہ گر کیا دیکھتے

جُز سرِ جوشِ جنوں کچھ بھی نہ تھا
اور ہم تلوار پر کیا دیکھتے

قیسؔ جن کو کھا گیا قد کا ملال
اُن درختوں پر ثمر کیا دیکھتے

کام رکھتے نہ کاج رکھتے ہیں
ہم بھی کیا تخت و تاج رکھتے ہیں

اپنے ذوقِ نمو سے ہیں سرشار
آب و گِل کا مزاج رکھتے ہیں

اپنی سوچوں کے بادشہ ہیں ہم
اپنے رسم و رواج رکھتے ہیں

ہم تو کیڑے ہیں اپنے پتھر کے
ہم بھی اپنا اناج رکھتے ہیں

دِل اُسی کا اسیر تھا کل بھی
وہ ضرورت جو آج رکھتے ہیں

قیسؔ کیا اہلِ ظرف ہیں ہم بھی
زخم کو لاعلاج رکھتے ہیں

کائنات اس قدر مکمل ہے
کہیں بے ربطگی نہیں ہوتی
جب شجر جاگتے ہوں بستی کے
تو زمیں رات بھر نہیں سوتی

وُہ جس کے چہرے پر سُکھ کا غازہ ہے
اُس کو میرے دُکھ کا کب اندازہ ہے

یہ جو پیاس کے بادل اُڑتے پھرتے ہیں
پچھلی رُت کی بارش کا خمیازہ ہے

روز وہاں اک چاند کو ڈھلتے تکتا ہوں
میرے دل کی اوٹ میں اِک دروازہ ہے

اَب کے ساون آئے گا تو سوچیں گے
کِس کِس زخم کا چہرہ کِتنا تازہ ہے

پتھر پھینک کے ہم کِتنا حیران ہوئے
بند کنویں میں یہ کیسا آوازہ ہے

یہ سامان جو بکھرا بکھرا ہے گھر میں
قیسؔ یہ میرا اپنا ہی شیرازہ ہے

جو بھی ملا خلوص سے اچھا لگا مُجھے
سارا قصُور ہی مِرے دِل کا لگا مجھے

آنکھوں میں اس کے جسم کی چاندی پگھل گئی
نکلا وہ گھر سے آج تو دریا لگا مجھے

اب کے بہار آئی تو ہم پھر بچھڑ گئے
یہ دکھ سمندروں سے بھی گہرا لگا مجھے

اِس بار بھی بہار نئے زخم دے گئی
پھر دُکھ سمندروں سے بھی گہرا لگا مُجھے

اپنی چمک دمک سے وہ دل میں اُتر گیا
پیتل کا ظرف دُور سے سونا لگا مُجھے

ندّی میں چاند پھینک دیا تھا کسی نے قیسؔ
پانی میں ہُو بہُو ترا چہرا لگا مجھے

ساری بستی سائیں سائیں، سائیں بابا
مُجھ کو میرے بھُوت ڈرائیں، سائیں بابا

یہ دل کا نازک سا بُوٹا اور یہ موسم
یہ پَت جھڑ کی تیز ہوائیں، سائیں بابا

تنہا دیکھ کے مُجھ کو پاگل کر دیتی ہیں
اِس خالی گنبد کی صدائیں، سائیں بابا

یہ میرے کمرے کی دیواریں یہ زِنداں
یہ میری سوچیں یہ بلائیں، سائیں بابا

وہ تو آنکھ بچا کر سب کچھ لے جاتا ہے
ہم کیا دل کی خیر منائیں، سائیں بابا

وہ مَیں نے جن کو پالا تھا اب وہ سپولے
میری جانب دوڑے آئیں، سائیں بابا

آ کر دیکھو سُورج کو تکتی رہتی ہیں
دُھوپ میں جلنے والی مائیں، سائیں بابا

وہ جو لوگ تھے جن کی دھرتی چاٹ گئی ہے
اُن سے کہو واپس آ جائیں، سائیں بابا

وہ تو پاگل ہے اب قیسؔ کو کیا سمجھائیں
دن میں چاند کہاں سے لائیں، سائیں بابا

یہ وصلِ یار کی کیسی گھڑی ہے
جُدائی شام سے سَر پر کھڑی ہے

ہم اُن کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں
مگر دِل کو بچھڑنے کی پڑی ہے

اُسے بھی زخم سُورج نے دِیے ہیں
مُجھے بھی سائے کی حسرت بڑی ہے

ذرا دیوار کے پیچھے تو دیکھو
محبت ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے

ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے لیکن
ہماری آرزو کتنی بڑی ہے

تمہاری یاد تم سے کیا چُھپائیں
نگینے کی طرح دل میں جڑی ہے

نکل آیا ہے سُورج میکدے سے
اُٹھو رِندو عبادت کی گھڑی ہے

مبادا قیسؔ گِر کر ٹوٹ جائے
محبت نوکِ مژگاں پَر اَڑی ہے

رکھتے اگر نہ ذہن میں ہم اُس کے دھیان کو
مِلتا کہاں سے حُسن، غزل کی زبان کو

نکلے تھے گھر سے رات کو سُورج خریدنے
وہ بند کر کے جا بھی چکا تھا دُکان کو

پتھر اُسی کے صحن میں بَرسے تمام رات
بویا تھا جس نے اپنی گلی میں چٹان کو

سَب کاروبارِ شوق تو وُہ ساتھ لے گیا
چُھپ چُھپ کے اب نہ دیکھئے خالی مکان کو

صرفِ وفا میں قیسؔ کچھ اِتنی مِٹھاس تھی
ہم کاٹنے لگے تھے خُود اپنی زبان کو

وہی درد کی نہایت وہی روز و شب کے نالے
کوئی نوکِ خارِ ہجراں مِری آنکھ سے نکالے

مَیں سفر میں تھک نہ جاؤں مرے ساتھ چل رہے ہیں
تِری روشنی کے منظر تِری شام کے اُجالے

بڑی دیر سے گلی کے اُسی موڑ پر کھڑا ہوں
کسی دن کوئی دریچہ وہی چاند پھر اُچھالے

کوئی رسمِ نو تو ڈالے کِسی جشنِ آستیں کی
کبھی آدمی خوشی سے کِسی سانپ کو تو پالے

مِری تشنگیِ مُسلسل مُجھے آزما رہی ہے
مِرے کام کُچھ نہ آئے مِرے پاؤں کے یہ چھالے

کبھی رنگِ شب کے حِیلے کبھی زُلف کے بہانے
مُجھے قیس ڈس رہے ہیں وہی ناگ کالے کالے

ایک ہی کام بس کیا ہم نے
دل کا نقشہ بدل دیا ہم نے
اپنے اندر ہی ہوگئے آباد
زخم کو گھر بنا لیا ہم نے

اُنہی کو آتا ہے ایسا کمال کر رکھنا
ہر ایک دِل کو ہوا میں اُچھال کر رکھنا

یہ دھوپ شہر میں خیمے لگا کے چھوڑے گی
مِرے لیے کوئی سایہ سنبھال کر رکھنا

عجب نہیں کہ مَیں عیسیٰ کے رُوپ میں آؤں
تُم اپنے گھر سے صلیبیں نکال کر رکھنا

اَب اِس سے بڑھ کے بھی کوئی عذاب کیا ہوگا
کِسی کے دل میں تمنّائیں ڈال کر رکھنا

اِک اُن کے قُرب میں یہ معجزہ عجب دیکھا
کہ جس سے مِلنا اُسے پائمال کر رکھنا

بس ایک بُھول ہی تو قیسؔ اُس نے مارا تھا
ذرا سی بات کا اِتنا ملال کر رکھنا؟

آنکھ دِکھلاتی رہی تصویر کیا
ہم سمجھتے خواب کی تعبیر کیا

ایک دل کا فتح کرنا تھا محال
شہر کرتے ہم بھلا تسخیر کیا

زخم کھایا ہے تو روتے کیوں نہیں
پاؤں میں چُبھتی نہیں زنجیر کیا

دِل دھڑکتا ہے ابھی تک دوستو!
وہ چلا بیٹھا ہے سارے تیر کیا

ناخنوں سے اُس نے کھودا ہے شجر
دیکھیے کرتا ہے اب تحریر کیا

لذّت دائم ہے کربِ عاشقی
لوگ کرتے دَرد کی تفسیر کیا

قیسؔ دِل ترکِ وفا پر ہے مُصِر
شہر میں ہوگی نہیں تشہیر کیا

❁

ٹہنیوں پر پھول شاخوں پر ثمر کِس کے لیے
ہر طرف بکھری ہے خُوشبوئے سَحَر کِس کے لیے

ڈھونڈتے پھرتے ہیں کِس کو کُو بکُو شمش و قمر
جنگلوں میں یہ ہوا ہے دَر بدَر کِس کے لیے

دوڑتے ہی جا رہے ہیں لوگ دشتِ شوق میں
وہ نہیں تو عُمر کا سارا سفر کِس کے لیے

بس یہی حسرت کہ کوئی ہم سے اِتنا پُوچھتا
ہم بناتے ہیں گھروندے ریت پر کِس کے لیے

وہ تو پچھلے موسموں میں بھی یہاں آیا نہیں
تو نے رکھ چھوڑا ہے یہ زخمِ ہنر کس کے لیے

حیرتیں ایسی کہ بند آنکھوں سے بھی دیکھا کریں
آب و گل میں یہ کشش اے کوزہ گر کس کے لیے

کشتیِ جاں کو تو ساحل پر ڈبو آئے تھے ہم
پھر یہ دریاؤں میں پڑتے ہیں بھنور کس کے لیے

روزنِ دل کس نے جلا رکھا ہے قیسؔ
ہو گئے روشن مرے دیوار و در کس کے لیے

۞

ہر قدم پر بکھر بکھر جانا
وہ مِرا شام ہی سے گھر جانا

روز جانا تری گلی کی طرف
اور ہواؤں سے پیشتر جانا

آرزو ایک پھول کی لے کر
وہ ہمارا شجر شجر جانا

یاد آتے ہیں پَر خیالوں کے
کتنی اُونچی اُڑان پر جانا

اِس قدر چاہنا اُسے دِل سے
اَپنی سوچوں سے آپ ڈر جانا

ڈوب جانا کبھی اِک آنسو میں
کبھی دریا کو پار کر جانا

ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُجالوں کو
رات کی آنکھ میں اُتر جانا

شہر وِیران ہوگیا تو مُجھے
یاد آیا ہے اس کے گھر جانا

اے پرندو! جہاں ہوا نہ چلے
ایسی بستی سے کُوچ کر جانا

قیسؔ جب بھی بہار آتی ہے
یاد آتا ہے دِل کا مَر جانا

عجیب شوق مُجھے شہر کے سفر کا ہے
پسِ خیال کوئی خواب بام و دَر کا ہے

تمام رنجش و راحت اِسی پہ ہے موقوف
یہ مسئلہ تو دل و جاں کا اِک نظر کا ہے

ہم اپنے شہرِ طلسمِ نظر میں ہیں آباد
جو راستہ بھی یہاں ہے وہ تیرے گھر کا ہے

دِیے جَلا کے ہواؤں کے پاس بیٹھا ہوں
یہ معجزہ مرے اندر کے اِک ہُنر کا ہے

وہ آکے بَر سے تو ہم مے کدہ اُٹھا لائیں
بس انتظار ہمیں ابرِ مُختصر کا ہے

مَیں اپنے دِل کی بہت دیکھ بھال کرتا ہوں
یہ داغدار ثمر بھی مِرے شجر کا ہے

کبھی یہ دُھوپ کبھی وہ ہوا نہیں آتی
یہ سانحہ بھی عزیزو ہمارے گھر کا ہے

شکستہ جاں تھے تو اُونچی اُڑان کیا بھرتے
سوال قیس پرندوں کے بال و پَر کا ہے

رنگ جو ہجر کا بیان میں تھا
وہ کہاں میری داستان میں تھا

اِک قیامت گُزر گئی سَر سے
مَیں ابھی تک اُسی کے دھیان میں تھا

جب بھی اُچھلا تو میرے سَر پہ لگا
ایک پتھر مِری چٹان میں تھا

دِل کو برباد کر گیا آخر
کوئی آسیب اِس مکان میں تھا

کِس ضرُورت نے اُس کو چاٹ لِیا
ایک ہی شخص تو جہان میں تھا

دِل نشانے پہ آ گیا ہے قیسؔ
کون بیٹھا ہوا مچان میں تھا

لوگوں نے کچھ ایسے بات بڑھائی تھی
ترکِ محبت میں بھی اَب رُسوائی تھی

نام ہوا بدنام محلّے والوں کا
گھر کو ہم نے خُود ہی آگ لگائی تھی

جس کے دل میں شوق تھا تم پر مرنے کا
اُس نے اپنی سُولی آپ اُٹھائی تھی

منظر گھر سے باہر بھی تو سُونے تھے
گھر کے اندر بھی دوہری تنہائی تھی

وہ میرے ہمسائے کا دروازہ تھا
دستک کی آواز یہاں سے آئی تھی

قیسؔ دُعا تو مانگی تھی صحراؤں نے
دریا پر بارش کِس نے برسائی تھی

کسی خطا کو مری درگزر نہیں کرتا
ہوا کے ساتھ وُہ کوئی سفر نہیں کرتا

تری جُدائی کے غم زدہ نہیں کرتی
ترا وصال کسے در بدر نہیں کرتا

ہمارے دِل کا بھی کیا ہے کہ ہم تو نالاں ہیں
یہ کوئی کام کبھی سوچ کر نہیں کرتا

ہزار خُون سے سینچو وفا کا پیڑ مگر
بہار میں بھی یہ پیدا ثمر نہیں کرتا

بڑے خلُوص سے مِلتا ہے گھر کا سایہ مجھے
یہ کام وہ ہے جِسے میرا گھر نہیں کرتا

وہ پھُول کیا ہے جو خوشبُو سے بھی رہے عاری
وہ شعر کیا ہے جو دل پر اثر نہیں کرتا

سب اُس کی شانِ تکبّر کو دیکھتے ہیں قیسؔ
ہمارے حال پہ کوئی نظر نہیں کرتا

مسئلہ تو ہے اَنا کا بابا
میرے اندر کی بلا کا بابا

یہ محبت جو لیے پھرتے ہو
ایک جھونکا ہے ہوا کا بابا

روز جنگل کو نکِل جاتا ہوں
فیض ہے گردشِ پا کا بابا

وہ بھی کرتا ہے خُدا کی باتیں
ڈر نہیں جس کو خُدا کا بابا

یہ صلیبوں پہ جو سر دیکھتے ہو
یہ نتیجہ ہے وفا کا بابا

زندگی زندگی کیا کرتے ہو
قرض ہے سر پہ خُدا کا بابا

قیسؔ آمد ہے کسی طوفان کی
شور سُنتے ہو ہوا کا بابا

اُس نے ہی تو خالی ظرف کو بھر رکھا ہے
ہم نے اپنے پیٹ پہ جو پتھر رکھا ہے

ریت میں تیرنا سیکھ لیا ہے اب لوگوں نے
اَپنے اَپنے دشت کو دریا کر رکھا ہے

ہم نے بھی پیَروں کے چکّر کاٹ دیے ہیں
اُس نے بھی دیوار کو اُونچا کر رکھا ہے

دُھوپ سے اپنے سارے رشتے ٹوٹ گئے ہیں
جب سے سَر پہ سایہ دار شجر رکھا ہے

ہم تو اب یہ کام بھی کر کے دیکھ چکے ہیں
کِس نے دن میں چاند ہتھیلی پر رکھا ہے

مَیں تو اپنی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا ہوں
تیرے قُرب نے جی میں کیسا ڈر رکھا ہے

یادوں کے یہ موسم اور یہ نرم ہوائیں
ہم نے اِس لمحے کا نام خبر رکھا ہے

اُس نے تو آنکھوں میں بھیڑ لگا رکھی ہے
بستی میں ہر شخص کو پاگل کر رکھا ہے

ہم تو قیسؔ بس اُس کے خاکے بیچ رہے ہیں
اصلی منظر تو اپنے اَندر رکھا ہے

ہر ایک دل کو فقط ایک ہی شکایت ہے
کہ اُس نے بستی جاں کو اجاڑ ڈالا ہے
وہ بے قصور ہے اُس کا کوئی قصور نہیں
مرے سلوک نے اس کو بگاڑ ڈالا ہے

کتاب دل میں اذیت کا باب چھوڑ گیا
مرے لیے وہ مسلسل عذاب چھوڑ گیا

ہے جس کے زخم کی خوشبو مرے ہنر میں ابھی
وہ آج پھر مری خاطر گلاب چھوڑ گیا

تھے جس کے فیض سے روشن مرے در و دیوار
سروں پہ دھوپ وہی آفتاب چھوڑ گیا

نہ جانے ریت سے نسبت تھی کیا مسافر کو
نظر میں دشت تو دل میں سراب چھوڑ گیا

گیا تو اتنی مسرت تھی اس کی آنکھوں میں
گناہگار کے گھر میں ثواب چھوڑ گیا

وہ شخص قیس نہ جانے کہاں سے آیا تھا
ہماری جاگتی آنکھوں میں خواب چھوڑ گیا

کبھی چلمن کبھی دَر یاد آیا
چاند کو دیکھ کے گھر یاد آیا

شور چڑیوں نے مچایا تو مُجھے
اپنے آنگن کا شجر یاد آیا

حرف بولے تو مَیں خاموش رہا
ہاتھ ٹوٹے تو ہُنر یاد آیا

پھر وہی دل وہی وحشت دل کی
پھر وہ جنگل کا سفر یاد آیا

اُڑ گئے آنکھ بچا کر پنچھی
اپنی محبت کا ثمر یاد آیا

کُھل گیا قیسؔ عبادت کا بھَرم
جب دُعاؤں کا اثر یاد آیا

ان ہواؤں سے رابطے رکھنا
یہ دریچے یہ در کھلے رکھنا

کبھی آنکھیں بجھا بجھا لینا
کبھی دیوار پر دیے رکھنا

اتنا آسان بھی نہیں ہوتا
ترک الفت کے حوصلے رکھنا

آنکھیں پتھرا کے ٹوٹ جائیں کہیں
اس قدر بھی نہ فاصلے رکھنا

پھول امیدوں کے بھی کھلیں گے قیسؔ
رشتہ قائم بہار سے رکھنا

چاند کی جانب ہمیشہ دھیان کیا
روشنی کا اس قدر ارمان کیا

خالی خالی سے نظر آتے ہو کیوں
لے گیا گھر سے کوئی سامان کیا

بارشیں اندر کہاں سے آ گئیں؟
پھر کُھلا رکھا تھا روشندان کیا؟

ڈھے گئیں ساری فصیلیں کُفر کی
کھا گیا مُجھ کو مِرا ایمان کیا

وہ انا کو بیچنے والے نہیں
آدمی کی بھی نہیں پہچان کیا

شہر کیا ایسے اُجڑ جاتے ہیں قیسؔ
آنکھ ہو جاتی ہے یوں ویران کیا

اپنے ایندھن کی حرارت سے سُلگتے رہنا
گھر میں رہنا بھی تو خاموشی سے جلتے رہنا

آج کی دُھوپ نے پیغام دیا ہے مُجھ کو
اپنی دیوار کے سائے سے بھی ڈرتے رہنا

کِتنا آسان ہے تیرے لیے اے زخمِ بہار
بیل کی طرح مِرے خون میں پھلتے رہنا

ایک ہی شغل ہے بس اب ترے دیوانے کا
بند کمرے میں ہواؤں کو پکڑتے رہنا

جمع کرنا تری پرچھائیاں دیواروں سے
آپ پتّوں کی طرح گھر میں بکھرتے رہنا

اَبر چھٹ جائے تو بارش کا نہ ہونا معلوم
درد گھٹ جائے تو آنکھوں کا برستے رہنا

ہم بھی دہلیز پہ بیٹھے ہیں بڑی آس لیے
قافلے والو اِدھر سے بھی گزرتے رہنا

زخم ترتیب سے رکھ دینا غزل ہے اے قیسؔ
شعر کہنا تو ہے بس خوں اُگلتے رہنا

تنکا ہوا کے سامنے آیا تو ڈٹ گیا
سارے غموں کا بوجھ مرے دل سے ہٹ گیا

یہ تو ترے جمال کی نیرنگیاں ہی تھیں
مَیں ایک اور لاکھ خیالوں میں بٹ گیا

صحرا کی وسعتوں سے بڑا ڈر لگا مجھے
پھیلا جو مَیں تو اپنے ہی اندر سمٹ گیا

ہم اہلِ احتیاط بھی تھے اہل ہوش بھی
وہ شخص تو بساط ہی دل کی اُلٹ گیا

جب بھی کبھی کسی نے اُسے بے وفا کہا
میرا وقار خود مری نظروں میں گھٹ گیا

اُن سے بچھڑ کے قیسؔ کچھ ایسا لگا مجھے
جیسے مرے وجود کا حصہ ہی کٹ گیا

روشنی کا دَر کُھلا رکھا گیا
ہر دریچے میں دِیا رکھا گیا

ہجرتوں کے نام کر دی زندگی
اور سفر کا حوصلہ رکھا گیا

سوزِ جاں کو لَے عطا کر دی گئی
سازِ دل کو بے صَدا رکھا گیا

کیا بتائیں حبس کے اِس شہر میں
نام ہر شے کا ہوا رکھا گیا

ترکِ اُلفت کی ضرورت تھی مگر
چاہتوں کا سلسلہ رکھا گیا

دِل میں اُس کا گھر بنایا اور قیسؔ
آنکھ کا رستہ کُھلا رکھا گیا

دوستی نا آشنائی تو ہوئی
ہم سفر تھے ہم، جدائی تو ہوئی

اُس کے جانے سے ہمیں تنہا تو ہوا
اُس کے غم سے آشنائی تو ہوئی

اُن کا اندازِ نظر کچھ بھی سہی
اِک محبت تھی پرائی تو ہوئی

چاند تھا وہ بادلوں میں چھپ گیا
راہبر سے بے وفائی تو ہوئی

چاہتوں میں سب خسارے ہی نہ تھے
اہلِ دل کو کچھ کمائی تو ہوئی

عادتاً ہم قیسؔ پیاسے ہی رہے
پر طبیعت کربلائی تو ہوئی

اک اک آنکھ میں اک اک سپنا تیرا ہے
ساری بستی کو خوابوں نے گھیرا ہے

وہ اک لہر ابھی جو ادھر سے اٹھی ہے
شاید اس نے دریا کا رخ پھیرا ہے

وہ کیا بات تھی جو لوگوں میں عام ہوئی
وہ کیا رشتہ ہے جو تیرا میرا ہے

پہلے یہ گلیاں کیا کیا آباد نہ تھیں
اب تو ہمارا جوگی والا پھیرا ہے

کرنیں بانٹ رہا ہے بستی بستی میں
چاند کے اپنے صحن میں گھور اندھیرا ہے

شام ڈھلے تو ہونے لگتا ہے آباد
قیس ہمارا دل چڑیوں کا ڈیرا ہے

وہ حرف حرف کو صرفِ حساب کر دے گا
خموش رہ کے مجھے لاجواب کر دے گا

وہ جائے گا مری آنکھوں کو بارشیں دے کر
مری رُتوں کو سپُردِ سحاب کر دے گا

کِرن کِرن وہ اُتر آئے گا دریچوں سے
نَفَس نَفَس وہ مجھے آفتاب کر دے گا

وہ بانٹ جائے گا ہر دل کو دَرد کی خوشبُو
ہر ایک زخمِ ہنر کو گلاب کر دے گا

وہ قیسؔ آئے گا تاریخِ دل رقم کرنے
محبّتوں کو شریکِ نصاب کردے گا

نظر کے ساتھ مرا شوقِ انتظار گیا
وہ شب گئی تو اِن آنکھوں کا اعتبار گیا

تمام عُمر لکیروں میں ہوگئی تقسیم
وہ ایک نقش مرے ذہن میں اُتار گیا

بس ایک پھول تھا ہمسائے کے گلستان میں
جسے میں دیکھنے روزانہ بار بار گیا

دھنک کے رنگ اِن آنکھوں میں پھرنہیں اُترے
دُکان بند ہوئی لُطفِ کاروبار گیا

نہ جانے کیا تھا کہ آنسو نکل پڑے اُس کے
وہ جاتے جاتے مِرا قرض بھی اُتار گیا

بھنور کی زد سے تو ہم قیسؔ بچ ہی نِکلے تھے
پر ایک شخص ہمیں ساحلوں پہ مار گیا

مسافتوں کے درمیان دیکھئے
لُٹے لُٹے یہ کاروان دیکھئے

یہ دشتِ دِل میں خواہشوں کی بستیاں
یہ ریت کے نئے مکان دیکھئے

وَرائے جاں بھی اِک جہان اور ہے
وَرائے جاں بھی میری جان دیکھئے

شباب سانپ کی طرح گزر گیا
اب آپ بیٹھ کر نشان دیکھئے

یہی تو سہلِ مُمتنع ہے جانِ قیسؔ
ہمارے شعر کی زبان دیکھئے

لبوں پہ زخم مگر شوقِ گفتگو رکھنا
جو ٹوٹ جائے دلوں میں وہ آرزو رکھنا

نہ جانے کب کوئی کس راستے سے آجائے
دِیے جَلا کے دریچے میں چار سُو رکھنا

کبھی کبھی تو سفر میں عجیب لگتا ہے
کسی درخت سے سائے کی آرزو رکھنا

کوئی مجھے مِری حالت سے بے خبر کر دے
بڑا عذاب ہے ہر شے کی جستجو رکھنا

مَیں اپنے خون کی لالی سے سرخرو ہوں بہت
مِرے مزاج میں شامل ہے رنگ و بُو رکھنا

ہم اہلِ دل اِسے مشکل نہیں سمجھتے قیسؔ
نشانِ داغِ تمنا کو سرخرو رکھنا

فرض کرو ہم جینا چاہیں اور جینا بیکار سا ہو
فرض کرو کہ مَر جانا بھی اپنے لیے دُشوار سا ہو

فرض کرو کہ ہم جب چاہیں دَریا پار اُتر جائیں
فرض کرو کہ ہم کو اپنا سایہ بھی دیوار سا ہو

فرض کرو کہ اُس کی باتیں دِل کو دُکھانے والی ہوں
فرض کرو کہ اُس کا لہجہ لکڑی کی تلوار سا ہو

فرض کرو کہ ہم شعروں سے سب کا جی بہلاتے ہوں
فرض کرو کہ اپنے دل کے اندر اِک آزار سا ہو

فرض کرو ہم روتے روتے سو جاتے ہوں شام ڈھلے
فرض کرو یہ رونا دھونا آنکھوں کو دَرکار سا ہو

فرض کرو کہ اک لڑکی ہو اور ہم اس کو چاہتے ہوں
فرض کرو کہ اس لڑکی کو بھی کچھ ہم سے پیار سا ہو

فرض کرو کہ اُس نے ہم کو ہنس ہنس کر ناشاد کیا
فرض کرو ہنس ہنس کر ملنا اُس کا کاروبار سا ہو

فرض کرو کہ بیٹھے بیٹھے ہم یہ سوچ رہے ہوں قیسؔ
چاہے ایک شجر ہو گھر میں لیکن سایہ دار سا ہو

گھر کی دیواروں کو تو گھر کھا گیا
میرے سب دریا سمندر کھا گیا

زندگی بے مہریوں نے چاٹ لی
چاہتوں کا سلسلہ زر کھا گیا

میں چٹانوں میں بسر کیسے کروں
رزق تو میرا یہ پتھر کھا گیا

کھا گئیں اُس کو واپسی کی کوششیں
میرے فن کو میرا پیکر کھا گیا

میں برہنہ سر تھا دشتِ شوق میں
میرا شانہ میری چادر کھا گیا

اُڑ گئی پھولوں سے خوشبوئے وفا
آنکھ کو چہروں کا منظر کھا گیا

قیسؔ ہم تعمیرِ دل کرتے رہے
غم ہمیں اندر ہی اندر کھا گیا

اُن کی صُورت بھی چاند جیسی ہے
اپنی نیّت بھی چاند جیسی ہے

دِل مِرا روز ڈوب جاتا ہے
اس کی عادت بھی چاند جیسی ہے

شہر کے لوگ بھی ستارے ہیں
اُن کی قِسمت بھی چاند جیسی ہے

میرے چہرے کی رَوشنی پہ نہ جا
غم کی دولت بھی چاند جیسی ہے

میرے گھر کا چراغ ہے سُورج
یہ حقیقت بھی چاند جیسی ہے

قیسؔ یہ دل بھی اِک پرندہ ہے
اور محبّت بھی چاند جیسی ہے

کہاں سے پیدا وہ امید کا جہاں کرتے
یہ کار سود بھی کرتے تو ہم زیاں کرتے

اسی لیے وہ ملا تھا کہ ہم اجڑ جاتے
خمار شوق میں اک عمر رائیگاں کرتے

کہاں سے لاتے وہ خوش فہمیاں محبت کی
کوئی گمان گزرتا تو ہم گماں کرتے

وہ ہم کو برزخِ ہجر و وصال میں رکھتا
کبھی چراغ جلاتے کبھی دُھواں کرتے

تری حدوں سے نکلتے نہیں ہیں ہم ورنہ
کسی ہنر کے لیے کوئی کسب جاں کرتے

عجب کہ ہم بھی پرندوں کے ہمنشیں ہوتے
کسی شجر، کسی ڈالی پہ آشیاں کرتے

وہ چاہتا تو کوئی راستہ دکھا دیتا
تلاش ہم دلِ رفتہ کہاں کہاں کرتے

وہ اپنے حسن کی آسائشوں سے تھا معذور
تو قیس قصۂ غم کس سے ہم بیاں کرتے

❁

وہ جو خوابوں کا نگر تھا کیا ہوا
اُس گلی میں ایک گھر تھا کیا ہوا

کیا ہوئی جو سامنے کی بات تھی
جو پسِ دیوار و دَر تھا کیا ہوا

پہلی پہلی وہ محبت کیا ہوئی
اِک جنوں شام و سحر تھا کیا ہوا

کیا ہوئے وہ اِس محلّے کے مکیں
جو شجر اُس موڑ پر تھا کیا ہوا

اِک طلب دائم حضورِ حُسن میں
اِک دلِ دَریوزہ گر تھا کیا ہوا

چلمنوں کی سر سراہٹ کیا ہوئی
نقش جو دیوار پر تھا کیا ہوا

ہم جہاں اکثر ملا کرتے تھے قیسؔ
شہر سے باہر کھنڈر تھا کیا ہوا

عجیب برزخ ہجر و وصال میں رکھا
رہائی دے کے مجھے اس نے جال میں رکھا

پس چراغ بڑی روشنی رہی جس نے
بس اک دھواں سا مرے ماہ و سال میں رکھا

جدائیوں میں تری آنکھ کی نمی رکھی
ترے خیال کو حسن خیال میں رکھا

خرد نے لاکھ پکارا مگر کہاں تھے ہم
جنوں نے ہم کو کچھ ایسے ابال میں رکھا

ہم اپنی ذات کی تکمیل میں رہے مصروف
ذرا سی بات نے برسوں ملال میں رکھا

اڑا کے لے گیا ہوش و حواس یادوں کے
وہ ایک حشر سا جو اس نے چال میں رکھا

یہی غزل تو مری حاصل غزل ہے قیسؔ
اسی غزل کو تو اس نے مثال میں رکھا

دِل کو غنچہ مثال رکھنا تھا
خُون کا رنگ لال رکھنا تھا

روشنی تو ضرور آتی ہے
کوئی روزن نکال رکھنا تھا

ہم تو اُڑتے ہوئے پرندے ہیں
آسمانوں میں جال رکھنا تھا

تشنگی اور یہ آب و گل کا جمال
مجھ کو حیرت میں ڈال رکھنا تھا

رات تو مختصر بھی ہو جاتی
کوئی ساغر اُچھال رکھنا تھا

قیسؔ بحرِ خفیف میں تھی غزل
ہم کو یہ بھی خیال رکھنا تھا

وہ رنگ رنگ گلوں کی مثال ایسا تھا
سب اس کو دیکھ رہے تھے جمال ایسا تھا

مِلا بھی وہ تو دلوں پر عجیب موسم تھے
جواں رتوں کے اُجڑنے کا سال ایسا تھا

وہ جس کے قُرب کی لذّت سے ہمکنار تھے ہم
ہمارے دل میں کوئی تو خیال ایسا تھا

نفس نفس پہ عجب آرزو کے پہرے تھے
نظر نظر میں تمنا کا جال ایسا تھا

پھر اُس کے بعد کوئی حادثہ نہیں گزرا
بچھڑ گیا ہے تو دل کو ملال ایسا تھا

نہ اُس کے قُرب میں راحت نہ اُس کی دُوری میں
کسے بتاتے کہ جاں پر وبال ایسا تھا

وہ قیس پوچھنے آئے تھے رنجشوں کا سبب
جواب کیا انہیں دیتے سوال ایسا تھا

اِس کڑی دُھوپ میں کسے دیکھوں
سب کے چہروں پہ آئنے دیکھوں

خُود ہی تُجھ کو بُھلا کے بیٹھ رہوں
خود ہی پھر دل کے حوصلے دیکھوں

رات کو دیر دیر تک جاگوں
گھر کے وِیران راستے دیکھوں

اب اِن آنکھوں کی کیا ضرورت ہے
اِن دریچوں سے اَب کِسے دیکھوں

مُجھ کو رنگوں میں ڈھال دے کوئی
مَیں بھی اُڑ کر زمین سے دیکھوں

تیری یادوں کو بار بار گِنوں
اپنی سوچوں کے دائرے دیکھوں

قیسؔ غربت میں گھر کی یاد آئے
جب بھی چڑیوں کے گھونسلے دیکھوں

اک شہر شہر ہجر کے اندر نکالنا
دیوار میں ضرور کوئی در نکالنا

اس دھوپ کا غرور نہ کرنا زمین پر
سائے کو اپنے قد کے برابر نکالنا

موسم بھی سازشوں میں ملوث ہے کیا کریں
دیکھا نہیں ہے چیونٹیوں کا پر نکالنا

ہمسائے کے مکان کی عادت عجیب تھی
کھڑکی سے روز چاند کا پیکر نکالنا

پتھر کے دل کو بھی کبھی تسخیر کرسکے
سینے سے ایسا درد کا لشکر نکالنا

یہ معجزہ تو قیسؔ ہماری نظر کا تھا
وحشت زدہ خیال سے منظر نکالنا

❁

دِل میں اِک ارمان بہت ہے
ایک کرن کا دھیان بہت ہے

آنکھیں اچھی ہو جائیں تو
چھوٹی سی پہچان بہت ہے

دل پتھر کا گھر ہے جس میں
شیشے کا سامان بہت ہے

ہم بے قیمت، ہم آوارہ
وہ رکھ لے تو مان بہت ہے

پہلے دل وِیران ہوا تھا
اب گھر بھی ویران بہت ہے

مَر مَر کر ہم جی لیتے ہیں
اللہ کا احسان بہت ہے

مشکل مشکل کیا کرتے ہو
مشکل تو آسان بہت ہے

جی سکتے ہو قیسؔ تو جی لو
مَر جانا آسان بہت ہے

پھر وہی سوچ کہ اب کیا ہوگا
تُجھ سے ملنے کا سبب کیا ہوگا

ہم تُجھے خُود ہی بُھلا بیٹھے ہیں
ہم پہ اَب اور غضب کیا ہوگا

اب نہ دل ہے نہ تمنا دل کی
اب ہمیں رنجِ طلب کیا ہوگا

تم سے مل کر بھی ہمیں چین کہاں
آدمی ہم سا عجب کیا ہوگا

ہم کہ بے نام و نشاں زندہ ہیں
ہم غریبوں کا لقب کیا ہوگا

نہ ہو تم قیسؔ، نہ شیشہ ہے، نہ جام
آج ہنگامۂ شب کیا ہوگا

آہستہ آہستہ محبت بن جاتے ہیں
ملتے ہیں تو لوگ ضرورت بن جاتے ہیں

اکثر ہم کو لُوٹ کے لے جاتا ہے کوئی
ہم راتوں کو مالِ غنیمت بن جاتے ہیں

ایک بہاؤں میں دل بہہ جاتا ہے اکثر
اکثر ہم دریا کی ضرورت بن جاتے ہیں

پہلے پہلے شام ڈھلے تو ڈر لگتا ہے
پھر سپنے آنکھوں کی عادت بن جاتے ہیں

جب وہ آنکھ سے دل میں اُترا تب ہم سمجھے
آئینے اِنسان کی قِسمت بن جاتے ہیں

اُن سے مل کر قیسؔ امارت مِل جاتی ہے
کھوٹے سِکّے اصلی دولت بن جاتے ہیں

❁

دبا دبا سا کوئی غم گمان میں رکھنا
اُسی کے درد کی شدت بیان میں رکھنا

محبتوں کے امیں ہو تو میرے ہم نفسو!
ہزار نوکِ خلش ایک جان میں رکھنا

یہی تو وصف ہے ہم نامراد لوگوں کا
زمیں پہ رہنا نظر آسماں میں رکھنا

فراغِ زخم سے ہم نے یہی تو سیکھا ہے
لہو کا ذائقہ اپنی زبان میں رکھنا

ملال یُوں نہیں ہوتا کہ اُن کی عادت ہے
ستم کا تیر ہمیشہ کمان میں رکھنا

ہمارے حوصلے دیکھو کڑکتی دھوپ میں بھی
سجا کے موم کے پتلے دکان میں رکھنا

اِدھر یہ خوف کہ دیوار کوئی گر نہ پڑے
اُدھر ہواؤں کو کچے مکاں میں رکھنا

وہ جس کے ہونے سے ملتا ہے منزلوں کا سُراغ
اک ایسا شخص بھی تم کاروان میں رکھنا

شکستہ پَر ہیں مگر قیسؔ اپنا شیوہ ہے
خیال یار کو اونچی اُڑان میں رکھنا

مَوج در موج بہا لے جائے
مُجھ کو طوفان اُٹھالے جائے

ایک لمحہ مُجھے روشن تو کرے
پھر وہ چاہے تو دِیا لے جائے

کیا زمانے کی ہوا ہے یارو!
دل سے خوشبوئے وفا لے جائے

جب بھی مَیں گھر کا دریچہ کھولوں
اِک کِرن میرا پتا لے جائے

مُجھ کو جنگل سے تو ہو آنے دو
پھر مُجھے کوئی بَلا لے جائے

کوئی آجائے کہیں سے اے قیسؔ
مُجھ کو اِس دُکھ سے چُھڑا جائے

لہروں کے آس پاس بھنور سے پڑے رہے
پانی میں معتبر کہاں کچے گھڑے رہے

بونوں کو ضد کہ قد کو بڑھانا ضرُور ہے
بیساکھیاں دبا کے بغل میں کھڑے رہے

اندھوں کے ہاتھ آئینے کرتے رہے فروخت
برسوں ہماری عقل پہ پتھر پڑے رہے

اُس نے بدن سے پیار کی چادر بھی چھین لی
ہم دیر تک زمیں پہ برہنہ کھڑے رہے

اے قیسؔ اَب کے موسمِ گُل بھی گزر گیا
ہم اِنتظارِ بُو کے بدن میں پڑے رہے

اپنی روداد سفر آبلہ پا سے کہنا
بات کہنی ہو تو بس اہل وفا سے کہنا

وہیں مل جائیں گے ہم اس کو تری یاد کیساتھ
دشت غربت میں چلی آئے بلا سے کہنا

کوئی آتا نہیں دروازے پہ دستک دینے
اس طرف سے بھی گزر جائے ہوا سے کہنا

نہ کبھی دل سے کسی شے کی تمنا کرنا
نہ کبھی صرف دعا دشت دعا سے کہنا

غنچہ کے دل پہ قدم رکھ کے نہ گزرے اے قیسؔ
فصل گل آئے تو یہ بات صبا سے کہنا

دھوپ نکلی تو بَلا کے سانحے ہوتے رہے
بیٹھ کر اپنے ہی سائے میں شجر روتے رہے

خواب ہی کوئی نہ تھا شاید کسی کی آنکھ میں
شہر والے اِس لیے آرام سے سوتے رہے

رات بَھر آتی رہی کانوں میں دستک کی صدا
پو پھٹے تک ہم بدن میں خواہشیں بوتے رہے

وہ بھی، لمبی ہجرتیں سر پر اُٹھا کر تھک گیا
ہم بھی اپنی منزلوں کے فاصلے ڈھوتے رہے

کوئی منظر ہی نہیں تھا قیصؔ پھر کیا دیکھتے
نیند کیا آتی کہ ہم تو رات بھر روتے رہے

کوئی نغمہ سرا ہے مَیں نہیں ہوں
جو مُجھ میں بولتا ہے مَیں نہیں ہوں

جسے سُن کر خفا ہیں آپ مُجھ سے
وہ میرا واقعہ ہے مَیں نہیں ہوں

صدائے دستکِ دل ہے یہ پیارے
تمھیں دھوکا ہُوا ہے مَیں نہیں ہوں

جِسے میں سوچتا ہوں وہ نہیں ہے
جِسے وہ چاہتا ہے مَیں نہیں ہوں

اُسی کے رنگ ہیں سرو و سمن میں
وہ پھُولوں میں چھپا ہے مَیں نہیں ہوں

اِدھر کیوں دیکھتی ہے قیسؔ دُنیا
وہ آئینہ نما ہے مَیں نہیں ہوں

یہ رنگِ چشمِ اِنتخاب ہی تو ہے
بدن پہ زخم کا گلاب ہی تو ہے

سدا کہاں یہ روشنی جمال کی
یہ ایک عرصۂ ثواب ہی تو ہے

محبتوں کی رُت بدل گئی تو کیا
وفا کا موسمِ خراب ہی تو ہے

حسین بارشوں کے خواب دیکھیے
یہ بُوند بُوند کا عذاب ہی تو ہے

ذرا ذرا سی بات پر قیامتیں
دُرونِ جاں یہ انقلاب ہی تو ہے

شباب کا نشہ تو قیسؔ اُتر گیا
خوشی سے پیجیے شراب ہی تو ہے

حُسن کو دادِ وفا دی جائے
پُھول کی عُمر بڑھا دی جائے

سَر میں فرہاد کا سَودا لے کر
دُودھ کی نہر بہا دی جائے

آپ چاہیں تو یہی پست زمیں
آسمانوں سے مِلا دی جائے

گھر سے نکلے تو یہی چاہتا ہے
شہر میں بھیڑ لگا دی جائے

اُس کے ہونٹوں پہ مسرّت کی لکیر
فن کا معیار بنا دی جائے

یوں کریں، آج کوئی چاندنی رات
اُن کی زلفوں میں چُھپا دی جائے

اِن ہواؤں کا تو مسلک ہے یہی
لَو کہیں بھی ہو بُجھا دی جائے

جس کو سایہ نہ ملے قیسؔ وہ دُھوپ
میری گلیوں میں بِچھا دی جائے

ایسا بھی نہیں کوئی جو وحشت سے نکالے
مجھ کو در و دیوار کی غربت سے نکالے

پھیلائے کوئی روشنی انصاف کی آ کر
کوئی تو مجھے ظلم کی ظلمت سے نکالے

میرے بھی شب و روز کوراس آئے تغیر
مجھ کو بھی کوئی عالم حیرت سے نکالے

ہم نے تو کھلے رکھے ہیں آنکھوں کے دریچے
وہ بھی تو کوئی چاند کبھی چھت سے نکالے

گلشن کے حوالے سے وہ آئے کسی رت میں
مجھ کو مرے موسم کی اذیت سے نکالے

شاید وہ مرے دل کے مقدر میں نہیں قیسؔ
راحت جو مجھے جبر کی حالت سے نکالے

کھڑکی کھلی ہوئی تھی مگر گھر کوئی نہ تھا
اُجڑے ہوئے مکان کے اندر کوئی نہ تھا

سب کی ہتھیلیوں پہ دِیے تھے شبِ فراق
سب جل رہے تھے اور منوّر کوئی نہ تھا

کیا کیا حسین لوگ تھے خوابوں کے شہر میں
کوئے نہ تھے تو آنکھ میں منظر کوئی نہ تھا

پَیروں کے زخم بن گئی صحرا کی گرم ریت
سایہ کسی درخت کا سر پہ کوئی نہ تھا

اب کی بتائیں قیسؔ کہ اُس شہرِ سنگ میں
سر پھوڑنے کے واسطے پتھر کوئی نہ تھا

دُھوپ نِکلی تو وہ گھر سے نکلا
کِس کا سَودا مِرے سر سے نکلا

پیڑ بویا تھا تو خوش تھے سارے
کیسا زہر اب ثمر سے نکلا

ڈھے گئی دل میں فصیلِ اُمید
مَیں اکیلا ہی کھنڈر سے نکلا

ہڈیا چاٹ گیا غم کا سراب
جب مَیں صحرا کے سفر سے نکلا

لے اُڑا مُجھ کو ترا دستِ خیال
مَیں زمینوں کے اثر سے نِکلا

شہر آسیب زدہ تھا اے قیسؔ
ہر کوئی جان کے ڈر سے نکلا

آئے مجھے بھی دور سے اس کی خبر کوئی
میں بھی تو سیکھ جاؤں صدا کا ہنر کوئی

مجھ کو بھی ان رتوں کا تغیر نصیب ہو
میں بھی کروں قبول ہوا کا اثر کوئی

دیکھے مجھے بھی کوئی دریچے سے جھانک کر
مجھ پر بھی مہربان ہو دیوار و در کوئی

یوں بھی تو ہو کہ میں بھی کسی کی دہائی دوں
میرے بھی زخم شوق پہ رکھے نظر کوئی

ہر شخص اس کے شہر کا پتھر فروش ہے
تعمیر کیا کرے وہاں شیشے کا گھر کوئی

آنکھیں سجا کے جسم پہ بیٹھے ہیں لوگ قیسؔ
آئے کہیں سے شہر میں اہل ہنر کوئی

خواہشیں بونے کا ہم کو شوق تھا
بے ثمر ہونے کا ہم کو شوق تھا

کون آنکھیں لے گیا برسات میں
ٹُوٹ کر رونے کا ہم کو شوق تھا

ایک بس ہم تھے کہ تنہا رہ گئے
بھیڑ میں کھونے کا ہم کو شوق تھا

آگہی آواز ہی آواز ہے
بے صدا ہونے کا ہم کو شوق تھا

خواب آنکھوں سے نکلتے ہی نہیں
چین سے سونے کا ہم کو شوق تھا

قیسؔ دل کا بوجھ تو اُٹھتا نہیں
حسرتیں ڈھونے کا ہم کو شوق تھا

جمال ہے تو مری رُوح میں اُتر آئے
وہ مُجھ کو پھُول کی خوشبُو میں بھی نظر آئے

اِسی خیال سے آنکھوں کی روشنی نہ گئی
وہ دن کا بھُولا ہوا شام کو تو گھر آئے

وہی اُجاڑ محلّے، وہی اُداس کھنڈر
ہم اپنی ذات کے اندر سفر بھی کر آئے

چلا گیا تھا چمن سے بہار کا موسم
ہماری شاخِ تمنّا پہ جب ثمر آئے

یہاں تھا وہ تو دریچے بھی بولتے تھے بہت
چلا گیا ہے تو دیوار و در سے ڈر آئے

سفر میں تھے تو کہیں قیسؔ ہم رُکے ہی نہیں
ہماری راہ میں کتنے گھنے شجر آئے

چار دن کی رفاقتیں بھی گئیں
وہ گیا تو محبتیں بھی گئیں

ہجر کی نیند سو گئے ہیں ہم
رتجگوں کی ضرورتیں بھی گئیں

شغلِ مے کا مزاج بھی نہ رہا
گم گئے ہو تو فرحتیں بھی گئیں

اب رلاتا کوئی نہیں ہم کو
وہ ذرا سی عداوتیں بھی گئیں

زخم بھی اب کوئی نہیں کھلتا
موسموں کی اذیتیں بھی گئیں

یہ ریاکاریوں کا دور ہے قیس
اہلِ دل کی کرامتیں بھی گئیں

آشوبِ شامِ ہجر کے کیا کیا ہراس تھے
دِل تو ہمارے کانچ کے کچّے گلاس تھے

یہ کیسے جانتے وہ ہمیں چاہتا بھی ہے
ہم بے ہنر کہاں کے ستارہ شناس تھے

بس یہ ہُوا کہ غیر سے کھائی شکستِ فاش
جس وقت سارے دوست مرے آس پاس تھے

سویا ہُوا سا درد بھی جاگا ہُوا سا تھا
ڈھانپے ہُوئے سے زخم بھی کچھ بے لباس تھے

پھر اُن سے مِل کے آئے ہیں تو کیا بتائیں قیسؔ
ہم بے ثمر درخت کی صُورت اُداس تھے

آنسوؤں سے دل کو دھونا چاہیے
ایک دن جی بھر کے رونا چاہیے

داغِ ہجراں سے ہے غم کی آبرُو
دل میں یہ موتی پرونا چاہیے

اُن کی یاد آئے تو دامانِ خیال
اَب زَم زَم میں بھگونا چاہیے

زخمِ فُرقت ہو کہ داغِ آرزو
دل کو تو بس اک کھلونا چاہیے

قیسؔ غم کی دُھوپ سر پر ہو اگر
زُلف کے سایے میں سونا چاہیے

وہ ایک لمحہ مُجھے یاد ہے صدا کی طرح
مرے قریب سے گزرا تھا وہ ہوا کی طرح

شُروعِ عشق میں ہی ہوگئے تھے ہم رسوا
یہ اِبتدا بھی ہُوئی ہم سے انتہا کی طرح

دُعائیں مانگتے پھرتے ہیں لوگ جس کے لیے
وہ زندگی ہی ہمیں کھا گئی بلا کی طرح

مَیں رنگ رنگ ہوں اُڑنا مرا مقدّر ہے
وہ اپنے بس میں نہ رکھے مجھے خُدا کی طرح

وہ ایک شخص بہت ہی عزیز ہے اے قیسؔ
جو چُھپ کے بیٹھا ہے مُجھ میں مری انا کی طرح

ہنس کر نبھا دیا گیا پیمان ہی تو تھا
کچے گھڑے پہ تیرنا آسان ہی تو تھا

میں ہی قصوروار سہی، بے وفا سہی
تو بھی محبتوں کا نگہبان ہی تو تھا

منزل پہ ہم پہنچ گئے ورنہ ترے بغیر
دل کا تمام راستہ ویران ہی تو تھا

ترک وفا سہی مُجھے لیکن ملا تو کر
میں تیرے شہر میں تری پہچان ہی تو تھا

وہ دوستی کے نام پہ کھاتا رہا فریب
مارا گیا خلوص میں انسان ہی تو تھا

پھر اس کے بعد قیسؔ کوئی آرزو نہ تھی
وہ شخص عام سا بھی مِری جان ہی تو تھا

ہوش تو میرے وہ تصویریں دکھا کر لے گئی
صحنِ گلشن سے ہوا پتّے اُڑا کر لے گئی

دن مُجھے یادوں کے پُتلے دے کے بہلاتا رہا
رات مُجھ کو تیری باتوں میں لگا کر لے گئی

اب کے مَیں کچّے مکانوں کی طرح ڈھینے لگا
آج کی بارش مِرا سب کُچھ بہا کر لے گئی

دِل کے گُلدستے میں رکھّے تھے تری یادوں کے پُھول
بے خیالی جانے کب ان کو چُرا کر لے گئی

دشت و صحرا کے تصور سے بھی مَیں واقف نہ تھا
میری وِیرانی مجُھے گھر سے بُلا کر لے گئی

مَیں تو جاتا ہی نہیں تھا قیسؔ اُس کے شہر میں
پر محبت مجھ کو سینے سے لگا کر لے گئی

جوڑ کر شیشے بنا رکھا تھا اک گھر آنکھ میں
پھر ہوا نے دُور سے پھینکا ہے پتھر آنکھ میں

پتا پتا کر گیا جنگل کی صُورت اختیار
قطرہ قطرہ بن گیا آخر سمندر آنکھ میں

آرزو کی فصل دل کی خشک سالی کھا گئی
رہ گیا سُوکھے ہُوئے پتوں کا منظر آنکھ میں

لمحہ لمحہ رُک گئی جا کر دریچے پر نظر
رفتہ رفتہ پڑ گیا پیروں کا چکر آنکھ میں

ٹھوکروں سے اُٹھ کے جو سر پر برس جاتے ہیں قیسؔ
ہم چُھپا لیتے ہیں وہ سارے ہی پتھر آنکھ میں

ترک تعلقات کے گہرے اثر میں تھے
ہم دونوں اپنی اپنی انا کے بھنور میں تھے

محروم روشنی سے مرا گھر نہیں ہوا
روزن کچھ اس طرح مرے دیوار و در میں تھے

کتنی محبتوں کی امیں تھی وہ ایک شام
کتنی جدائیوں کے پتے اک سحر میں تھے

یوں تو بڑا جمود تھا حدِ نگاہ تک
دیکھا تو سارے قافلے اب تک سفر میں تھے

پتھر وہی اچھال رہے تھے ہوا میں قیسؔ
جو لوگ اتفاق سے شیشے کے گھر میں تھے

کوئی آنکھوں کے آس پاس نہیں
پھر بھی یہ لوگ کیوں اُداس نہیں

ہوسکے تو سنبھال کر رکھنا
دِل کوئی کانچ کا گلاس نہیں

تشنگی پھُوٹ پھُوٹ کر روئی
مَیں یہ سمجھا کہ مجھ کو پیاس نہیں

اب کوئی زخم اوڑھ کر نہ پھرے
یہ محبت کسی کو راس نہیں

خواہشوں کا بدن نہیں ہوتا
آرزُو کا کوئی لباس نہیں

سارے موسم بدل گئے ہیں قیسؔ
اب کسی گُل میں تیری باس نہیں

تھوڑا تھوڑا تم جیسا ہے
چاند مُجھے اچھا لگتا ہے

اُڑتا بادل یہ کیا جانے
کِس کِس کے گھر میں صحرا ہے

ساری دُنیا سوچ رہی ہے
تیرا میرا کیا رشتا ہے

سائے کِس کے کام آئے ہیں
دیواروں میں کیا رکھا ہے

اِس موسم میں کون آئے گا
کھڑکی سے کیا جھانک رہا ہے

جی کرتا ہے مَیں بھی دیکھوں
چڑھتا سورج کیا ہوتا ہے

اب وہ منظر قیسؔ کہاں ہیں
خواب تو میں نے بھی دیکھا ہے

اِن آنکھوں کی سب سے مہنگی سب سے پیاری مٹّی
جن کے ہاتھ ہیں پھولوں جیسے اُن پر واری مٹّی

سب سے ہلکا چاندی سونا سب سے بھاری مٹّی
دِل ہی اپنا سچّا ساتھی باقی ساری مٹّی

ذرّے ذرّے میں اک چہرہ چاند ستاروں جیسا
ہے اِک شخص کی چاہت میں سرشار ہماری مٹّی

اُس کے غم کی تیز ہوائیں اور ہجراں کے موسم
کون سمیٹے آ کر یارو آج ہماری مٹّی

آنگن آنگن آ بیٹھی ہے دُھوپ لگا کر خیمے
سُورج کے دُکھ جھیل رہی ہے پھر دُکھیاری مٹّی

مِل جائے تو اُس کے غم کو دِل میں بو کر رکھنا
ورنہ پھر کس کام آئے گی درد سے عاری مٹّی

دِل گلشن میں غم کے بُوٹے زخموں کے گلدستے
سوچو تو زرخیز بہت ہے قیسؔ ہماری مٹّی

ٹھہر ٹھہر کے گلی سے گزر گئی ہے ہوا
بہت اُداس تھی جانے کِدھر گئی ہے ہوا

قریب تر ہُوا جاتا ہے درد کا احساس
کشاں کشاں رگِ جاں میں اُتر گئی ہے ہوا

وہی سماں، وہی ظلمت، وہی کھنڈر، وہی شب
مرے وجُود کے جنگل سے ڈر گئی ہے ہوا

بکھر گیا ہے ہر اک سمت رنگ وبُو کا جمال
ترے بدن کی مہک بانٹ کر گئی ہے ہوا

نہ کوئی دَر، کوئی روزن، نہ کوئی دروازہ
مِرے مکان کے اندر ہی مر گئی ہے ہوا

کبھی تو قیسؔ کوئی اِس کا بھی صِلہ دیتا
نفس نفس پہ جو احسان کر گئی ہے ہوا

مشکلوں سے غزل میں ڈھالے ہیں
دل کے اَرمان ہی نرالے ہیں

پھول کا رنگ چاند کا چہرا
سب تری ذات کے حوالے ہیں

اِس کو کہتے ہیں سازشِ موسم
چیونٹیوں نے بھی پر نکالے ہیں

آستیں کا نصیب، تھا ورنہ
سانپ کس نے خوشی سے پالے ہیں

میرے آنگن کی روشنی پہ نہ جا
سب ترے پیار کے اُجالے ہیں

آج ہم نے ذرا سی پی کر قیسؔ
سر سے کتنے عذاب ٹالے ہیں

پھول نظر آئے تو پتھر لگتا ہے
آنکھ کھلی رکھتا ہوں تو ڈر لگتا ہے

اک دن اس کو دیکھ لیا تھا کھڑکی میں
تب سے ہر دیوار میں اک در لگتا ہے

کچھ تیری گلیوں کی قسمت کھوٹی تھی
کچھ میرے پیروں کا چکر لگتا ہے

کیسے کیسے ارماں تھے جو ڈوب گئے
دل کے اندر ایک سمندر لگتا ہے

میری آنکھوں کی ویرانی کو بھی دیکھ
وہ میلہ بھی دیکھ جو اندر لگتا ہے

قیسؔ یہاں ہر شخص کی سوچیں پتھر ہیں
ہر انسان یہاں کا بنجر لگتا ہے

فراز عرش پہ اپنا شکار تارے تھے
وہ دن کہ ہم بھی ہواؤں کے ساتھ اڑتے تھے

ہمیں تو آگ لگا کر چلا گیا موسم
کہ ہم تو پانی میں رکھے ہوئے بھی جلتے تھے

میں اس کے ساتھ ہی رہتا جہاں بھی رہنا تھا
جدائیوں کے یہ دن تو عذاب جیسے تھے

پھر اس کے بعد وہ تنہائیوں کا شور اُٹھا
ہم اپنے گھر سے نکلتے ہُوئے بھی ڈرتے تھے

وہ دل میں تھا تو عجب روشنی تھی آنکھوں میں
مجھے یہ چاند ستارے عجیب لگتے تھے

یہ دھوپ ہی تھی جو رنگوں کو کھا گئی ورنہ
گئی رتوں میں یہ چہرے گلاب جیسے تھے

اب آہٹوں پہ بھی کوئی گماں نہیں ہوتا
ہم ایک ایک صدا کا حساب رکھتے تھے

زمانہ بیت گیا عرصۂ شمار میں قیسؔ
یہ دیکھنا تھا کہ لمحوں میں سال کتنے تھے

دریاؤں سے کیا ہوتا ہے
دل اکثر پیاسا ہوتا ہے

اب تو ہم بھی سیکھ گئے ہیں
جلنا بجھنا کیا ہوتا ہے

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں
زخم کہاں اچھا ہوتا ہے

سکھ اُس کا گہنا ہوتے ہیں
دُکھ جس نے دیکھا ہوتا ہے

یوں تو سارے خوش رہتے ہیں
سب کو روگ لگا ہوتا ہے

آنکھیں قیسؔ کہاں کھُلتی ہیں
خواب اگر دیکھا ہوتا ہے

پتّھر اُسے ماریں تو گِلہ بھی نہیں کرتا
جو ظرف بھرا ہو وہ صدا بھی نہیں کرتا

وہ مُجھ سے چھپاتا بھی نہیں حُسن کی دولت
اور قرضِ محبت کو ادا بھی نہیں کرتا

رکھتا ہے مرے زخم کی حالت پہ نظر بھی
بے چَین بھی رہتا ہے دوا بھی نہیں کرتا

کہنے کو تو اِک ربط سہی اُس کو مرے ساتھ
مِلتا بھی نہیں میرا پتا بھی نہیں کرتا

ہر دل کے مقدر میں محبت نہیں ہوتی
ہر شخص سے ہر شخص وفا بھی نہیں کرتا

دیتا بھی نہیں قیسؔ مجھے وصل کی خیرات
دامانِ محبت سے جُدا بھی نہیں کرتا

بنامِ عشق دل و جاں نثار کرنا ہے
تو یوں کہو نا کہ دریا کو پار کرنا ہے

ابھی تو قرضِ محبت ادا ہُوا ہی نہیں
ابھی تو کچے گھڑے نے بھی وار کرنا ہے

تمام عرصۂ غم ہے حیات کا عرصہ
خوشی تو قُرب کی گھڑیاں شمار کرنا ہے

ابھی تو مَیں کسی عالم میں بھی مقیم نہیں
ابھی تو اُس کو بڑا انتظار کرنا ہے

گئی رُتوں سے کہو لوٹ کر چلی آئیں
کہ ہم نے رَحم سُپردِ بہار کرنا ہے

کسی چراغ کی لَو تم بھی ساتھ لے جانا
اگر تمہیں بھی سفر اختیار کرنا ہے

بڑا ہی شوق تھا اِک روز اپنے آنگن میں
شجر لگا کے اُسے سایہ دار کرنا ہے

یہ اور بات کہ وہ باکمال ہے کہ نہیں
ہمارا کام اُسے باوقار کرنا ہے

وہ اپنی قید میں رکھ کر بھی خوش نہیں مُجھ سے
اب اُس کو میری اَنا کا شکار کرنا ہے

چلو کہ دَشت میں دل کی دُکان کھولیں قیسؔ
ہمیں جنوں کا کوئی کاروبار کرنا ہے

دُھوپ سر پر آئی تو سایہ گیا
اِک بھرم دیوار و دَر کا تھا، گیا

ہم ہی تنہا رہ گئے اُن کے بغیر
اور دُنیا میں کِسی کا کیا گیا

اُن کی یاد آئی تو پہروں بیٹھ کر
اپنے بارے میں بہت سوچا گیا

اُن کا غم، اُن کا کرم، اُن کی طلب
سر مِرا تلوار پر رکھا گیا

آبلہ پائی نے ہمّت توڑ دی
سر سے منزل کا نہ پھر سودا گیا

قیسؔ اِتنی تلخیاں چہرے پہ تھیں
آئنے کا مُنہ نہیں دیکھا گیا

منظر تو کسی کو بھی دکھائی نہیں دیتا
پھر بھی کوئی آنکھوں کی دُہائی نہیں دیتا

اک شورِ بلا خیز ہے اِس گنبدِ جاں میں
وہ مُجھ کو پکارے تو سُنائی نہیں دیتا

یہ زخم بھی شاید وہی دیتا ہے دلوں کو
جو پُھول کو خوشبُو سے رہائی نہیں دیتا

آتا ہی نہیں کوئی دھنک رنگ کا موسم
پیغام کوئی دستِ حِنائی نہیں دیتا

ہر لمحہ مِرے ساتھ ہے خوشبُو کے سفر میں
وہ شخص کسی رُت میں جُدائی نہیں دیتا

پانی میں کوئی عکس ٹھہرتا ہی نہیں قیسؔ
آئینے میں اب کچھ بھی دِکھائی نہیں دیتا

✿

جو سامنے نہیں ہے وہی دیکھتا ہوں میں
خود اپنی ذات کے لئے اِک مسئلہ ہوں میں

آتا ہے خوف خُود مجھے اپنے وجُود سے
یہ کِس بَلا کے جنگلوں کا راستا ہوں میں

نیرنگیٔ جمال میں گم ہوں نفس نفس
اک آرزوئے شوق میں پھر مُبتلا ہوں میں

شاید مَیں اپنے کرب کے اندر مقیم ہوں
شاید ترے خیال سے چُھپتا رہا ہوں میں

آئے نہ اعتبار تو پھر چُھو کے دیکھ لو
ٹُوٹا ہُوا نہیں ہوں تو بکھرا ہُوا ہوں میں

یہ سانحہ بھی دِل پہ گزرنا تھا ایک روز
اب تم بِچھڑ گئے ہو تو یہ سوچتا ہوں میں

ہوگا کبھی تو ختم مِری ہجرتوں کا سال
اے ہمنشیں ہمیشہ سفر میں رہا ہوں میں

اُس کی اَماں میں ہوں تو بڑے حوصلے ہیں قیسؔ
جیسے بہت سنبھال کے رکھا ہُوا ہوں میں

۞

❁

وہ ہاتھ پھول، وہ چہرا گلاب جیسا تھا
ورق ورق وہ مقدس کتاب جیسا تھا

وہ حرف حرف تھا تفسیرِ شوقِ جاں کی طرح
وہ لفظ لفظ مکمل نصاب جیسا تھا

مرا ہی عکس تھا اُس میں مِٹا مِٹا ہی سہی
یہ آئنہ ہی مرا سطحِ آب جیسا تھا

برس گیا مری آنکھوں کی خشک سالی پر
ترے خیال کا پر تو سحاب جیسا تھا

مَیں اُس کا ہجر نہ چاہوں کسی وصال کے بعد
وہ میری جاگتی راتوں میں خواب جیسا تھا

جو بات لب پہ نہ آئی دُعاؤں جیسی تھی
جو درد دل سے نہ نکلا ثواب جیسا تھا

کبھی کبھی مرے رونے میں ایک لذّت تھی
کبھی کبھی میرا ہنسنا عذاب جیسا تھا

وہ جس کے قرب نے روشن کیا ہے قیس مجھے
وہ شخص عام سا بھی اِنتخاب جیسا تھا

قُربتوں کی رَوشنی اچھی لگی
اُن سے مِل کر زندگی اچھی لگی

جب بھی گزرے ہیں لب و رُخسار سے
پُھول کی پتّی بڑی اچھی لگی

عظمتِ دَیر وحرم اپنی جگہ
ہم کو تو اُس کی گلی اچھی لگی

جُھوم کر برسا مرے دریاؤں پر
اَبر کی دریا دلی اچھی لگی

لُطف ہنسنے کا مِلا رونے کے بعد
غم اُٹھائے تو خوشی اچھی لگی

اُس نے رو رو کر مجھے رُخصت کیا
وہ جُدائی کی گھڑی اچھی لگی

شوق سے سُنتا ہے وہ میری غزل
یہ خبر اُڑتی ہوئی اچھی لگی

پھر دریچے سے اُتر آئی کرن
پھر مجھے یہ چاندنی اچھی لگی

بارشوں میں قیسؔ ہم جلتے رہے
ہر ادا برسات کی اچھی لگی

❁

ہر اِک موسم میں جی ٹھنڈا ہے میرا
یونہی دل پھولتا پھلتا ہے میرا

مری مٹی سے میری آبرو ہے
ہر اِک غنچہ ترو تازہ ہے میرا

ابھی آنگن میں تیری روشنی ہے
ابھی دیوار پر سایہ ہے میرا

مَیں اپنے حافظے میں رہ گیا ہوں
وہی گلیاں وہی رستا ہے میرا

اِنھی کے ساتھ گزری ہے جوانی
درو دیوار سے رشتا ہے میرا

مَیں اپنے شہرِ دل کا تاجور ہوں
یہاں جو کچھ بھی ہے اپنا ہے میرا

لڑکپن، پھر جوانی، پھر بڑھاپا
نہایت مختصر قِصّہ ہے میرا

بہت عرصہ ہُوا میں مرچکا ہوں
غنیمت ہے کہ دل زندہ ہے میرا

مَیں صحرا ہوں مگر پیاسا نہیں قیسؔ
مرے پہلو میں اک دریا ہے میرا

میری جانب تری آنکھوں کا اشارہ کیوں تھا
اِس بلندی سے مجھے تو نے پکارا کیوں تھا

اے مری سوچ کو خوش رنگ بنانے والو!
مجھے سر سبز زمینوں پہ اُتارا کیوں تھا

کیوں مرے ذہن میں تعمیر محبت کی تھی
مجھ کو اِس کربِ مسلسل سے گزارا کیوں تھا

جسے سوچا جسے چاہا بھی نہیں تھا تم نے
پھر وہی شخص تمہیں جان سے پیارا کیوں تھا

تم اگر قیسؔ اِسے ترکِ وفا کہتے ہو
تو مرے دل کو ہر اک داغ گوارا کیوں تھا

آنکھیں بہت اداس تھیں چہرہ بھی زرد تھا
اُس کے لہو میں ہجر کی راتوں کا درد تھا

جلتا رہا حرارتِ دل سے تمام رات
پھر بھی وہ شخص راکھ کے مانند سرد تھا

بارِ الم سے ٹوٹ گیا پر جُھکا نہیں
وہ آپ کا اسیر بھی کیا خُوب مرد تھا

ڈھلتے ہی دُھوپ رات کا غم کھا گیا اُسے
سُورج کا رنگ پُھول کے مانند زرد تھا

ہم قیسؔ اُن کی یاد سے آگے نِکل گئے
آئینۂ خیال جہاں گرد گرد تھا

میں سو گیا ہوں یاد تری جاگتی نہ ہو
سر پر ترے خیال کی چادر تنی نہ ہو

آنکھوں پہ تیرا ہاتھ ہے اب تک دھرا ہوا
شاید کہ نخل درد کی ٹہنی ہری نہ ہو

دیتا نہیں سروں کو کبھی دھوپ سے امان
اے دوست جس درخت کی چھاؤں گھنی نہ ہو

یوں ہی نظر اُٹھا کے کوئی دیکھتا نہیں
جب تک کسی کا منظر دل دیدنی نہ ہو

کچھ بھی ہو اس میں ہجر کی محرومیاں نہ ہوں
شام فراق ہو بھی تو سہمی ہوئی نہ ہو

عرصہ گزر گیا جسے دیکھا تھا ایک بار
اب سوچنے لگا ہوں مری زندگی نہ ہو

سن کر صدائے در کبھی دیتا نہیں جواب
ڈرتا ہوں یہ خوشی بھی کہیں عارضی نہ ہو

ایسی شب برات کی کیا آرزو کریں
گھر میں چراغ دل میں کوئی روشنی نہ ہو

ہم قیسؔ ظرف ذات سے واقف تو ہیں مگر
ڈرتے ہیں آرزو کوئی دل سے بڑی نہ ہو

۞

شاخ شجر سے دور ہوں، برگ بریدہ ہوں
گلشن پرست ہی سہی دامن کشیدہ ہوں

کوئی نہ مجھ کو ذہن میں محفوظ رکھ سکا
اس گنبد حیات میں حرف شنیدہ ہوں

شاید کسی کے پاس ہو اس زہر کا علاج
میں اِس ہجوم شہر میں مردم گزیدہ ہوں

مجھ پر برس بھی جا کبھی آ کر بہار میں
اے ابر میں بھی سوزش غم سے تپیدہ ہوں

یہ ذوق و شوق چشم و نظر ان سے پوچھیے
میں نامراد آرزو راحت ندیدہ ہوں

اس کو برہنہ سر کبھی رہنے نہیں دیا
یہ بات اور ہے کہ میں دامن دریدہ ہوں

اے رہروان شوق مجھے بھی تو دیکھ لو
میں اس جہان کرب میں عبرت رسیدہ ہوں

اب تو قدم زمین پہ لگتے نہیں ہیں قیسؔ
ان کی نگاہ لطف و کرم کا چنیدہ ہوں

❁

لکھنے والو جو بھی لِکھنا نام ہوا کے لِکھنا
سچی باتیں اپنی ذات سے باہر آ کے لکھنا

اِن پھُولوں کا اِن چہروں کا ذکر بھی کرتے رہنا
اپنے اندر رنگوں کی قندیل جلا کے لکھنا

لفظوں کی ترتیب کے فن پر آنچ نہ آنے دینا
بے شک تم اپنے ہاتھوں کو آگ لگا کے لکھنا

ہجر کی شب کی پہلی بارش وصل کی پہلی شبنم
قطرہ قطرہ سارے موسم شہرِ وفا کے لکھنا

یوں لکھنا کہ حرفوں کی تصویریں بنتی جائیں
ممکن ہو تو اُس کو اپنے پاس بٹھا کے لکھنا

آنے والی رُت کا اِستقبال بھی کرنا ہوگا
جانے والے موسم کا ہر زخم بھلا کے لکھنا

یہ بھی لکھنا عشق میں تم نے کیا کھویا کیا پایا
دل سے رِسنے والے سارے زخم دعا کے لکھنا

قیسؔ جگر کا خون بھی شامل کرلینا شعروں میں
کِشتِ غزل میں رنگ برنگے پھول کھلا کے لکھنا

دل کا دروازہ کب کھولو گے
بولو لوگو! سچ کب بولو گے

سارے درد چھپا کر پھرتے ہیں
تم کس کس کا سینہ پھولو گے

کیا ٹھہراؤ گے معیار وفا
دل کو کس تکڑی میں تولو گے

کونسی مٹی لے کر آؤں میں
کس مٹی میں مجھ کو رولو گے

اتنے پھول کہاں سے لائے ہو
ان سے کتنے ہار پرولو گے

سانپ تو سارے ڈسنے والے ہیں
تم کس کس کا رونا رو لو گے

اتنی میٹھی ہوگی قیسؔ غزل
اس میں جتنی شکر گھولو گے

جس کو سجا کے لائے تھے سونے کے طشت میں
پتھر لکھے ہوئے تھے اُسی دل کے بخت میں

سُورج کی دُھوپ پھر مری آنکھیں جلا گئی
سایہ چُھپا رہا مرے گھر کے درخت میں

لڑتا رہا مَیں جس کے لئے سارے شہر میں
اُس شخص کا بھی ہاتھ تھا میری شکست میں

آنکھوں میں ریت ڈھونڈ رہا ہے ملال کی
دِل مبتلا ہوا ہے عجب کارِ سخت میں

سب جا کے بس گئے ہیں اُسی کی گلی میں قیسؔ
راحت کسی کو بھی نہ ملی تاج و تخت میں

چادرِ شب اوڑھ کر بیٹھے رہے
ہم گلی کے موڑ پر بیٹھے رہے

دستکیں دیتا رہا اُن کا خیال
ہم کو جانا تھا مگر بیٹھے رہے

خاکِ غربت پاؤں سے لپٹی رہی
لے کے ہم رنجِ سفر بیٹھے رہے

ہمسفر سب کارواں سے جا ملے
ایک ہم ہی بے ہُنر بیٹھے رہے

ایک دن دریا بلائے گا ہمیں
اس لیے ہم ریت پر بیٹھے رہے

آئینہ اندھے اُٹھا کر لے گئے
آنکھ والے بے خبر بیٹھے رہے

دُھوپ کا میلہ لگا تھا شہر میں
قیسؔ اک ہم تھے کہ گھر بیٹھے رہے

دل کی بستی کو ویران بھی رکھنا ہے
گھر آباد رہے یہ دھیان بھی رکھنا ہے

ترکِ تعلق بھی کرنا ہے اپنوں سے
غیروں سے عہدو پیمان بھی رکھنا ہے

روزن ہی سے دُھوپ آئے تو کام چلے
دیواروں پر کچھ سامان بھی رکھنا ہے

یہ ساون پھر کب تک لوٹ کے آئے گا
دل میں بو کر اِک ارمان بھی رکھنا ہے

منظر کو تکنا ہے ہر اک پہلو سے
اور آنکھوں پر پردہ تان بھی رکھنا ہے

قیسؔ غزل بھی بونی ہے کِشتِ دل میں
اور شعروں میں دل کا مان بھی رکھنا ہے

سہمی سہمی دور افق سے اتری تھی کل شام
قطرہ قطرہ اک تنہائی برسی تھی کل شام

تاروں کی جھلمل آنکھوں میں تھی صدیوں کی پیاس
اک اک بوند کرن کی خاطر ترسی تھی کل شام

ماضی کی کھڑکی سے مجھ کو جھانک رہا تھا درد
رنگوں کی بارات جو لے کر گزری تھی کل شام

اس کا چہرہ دیکھ کے چھت پر آ پہنچا تھا چاند
اس کی زلفوں کے جنگل سے نکلی تھی کل شام

پہلے ہاتھ میں سورج لے کر تم کو ڈھونڈا تھا
پھر پیڑوں کی شاخوں پر جا بیٹھی تھی کل شام

اس کے جانے سے آنگن میں کتنا برسا ابر
اپنی بارش کے پانی میں بھیگی تھی کل شام

میں نے تو اپنی دیواروں میں روزن ڈالا تھا
میرے آنگن میں کیا لینے آئی تھی کل شام

اُس نے تو پھر وعدہ کر کے توڑ دیا تھا ہمیں
مجھ کو تنہا دیکھ کے کتنا روئی تھی کل شام

فریبِ حسن میں جو مبتلا نہیں ہوتا
وہ دل کبھی بھی کسی کام کا نہیں ہوتا

کبھی کبھی ہمیں ہوتی ہے بحر و بَر کی خبر
کبھی کبھی ہمیں اپنا پتا نہیں ہوتا

بڑے عذاب میں ہوتے ہیں اُس زمیں کے لوگ
جہاں کسی سے کوئی معجزہ نہیں ہوتا

غرض کی تیز ہوا سے بچا کے رکھنا دوست
وفا کا پیڑ ہمیشہ ہرا نہیں ہوتا

جو دستکیں سی درِ دل پہ آ کے دیتا ہے
تری قسم کوئی تیرے سوا نہیں ہوتا

تمہارا درد بھی چہرے بدلتا رہتا ہے
ہمارا غم بھی کبھی ایک سا نہیں ہوتا

بس ایک بار اُسے چھو کے دیکھنا تھا قیسؔ
ہزار چاہا مگر حوصلہ نہیں ہوتا

ایک منظر بھی تو منظر سا نہیں
پر مرے دیوار و در میں کیا نہیں

رُوح پیاسی ہے کسے جا کر کہیں
ابر اس موسم میں بھی برسا نہیں

روشنی بھی اک ضرورت ہے مگر
جس میں ہم رہتے ہیں گھر ایسا نہیں

وہ تو اِک ٹوٹا ہوا اِنسان تھا
تم نے اُس کو غور سے دیکھا نہیں

ہر سرابوں کی زمیں کے لوگ ہیں
اپنے رستے میں کوئی دریا نہیں

قیسؔ اس میلے میں وہ بچّہ ہوں میں
جو کھلونے کے لیے روتا نہیں

نہ آیا راس ہمیں اُس سے نفرتیں کرنا
بچھڑ کے پھر اُسے ملنے کی خواہشیں کرنا

ہمیں تو آج بھی اس کی ضرورتیں ہیں بہت
اُسی نے چھوڑ دیا ہے رفاقتیں کرنا

جو سوچیے تو ابھی کل کی بات لگتی ہے
وہ اُن سے ملنا تو کیا کیا شرارتیں کرنا

شکایتیں بھی بہت تھیں حکایتیں بھی بہت
اُنہی سے لڑنا اُنہی سے محبتیں کرنا

ملال دل کا وہ عالم جنوں کا عالم تھا
کہ جس کا رنج اُسی کی حمایتیں کرنا

گزر گئے ہیں تو وہ دن عجیب لگتے ہیں
ذرا سی بات پہ کیا کیا عداوتیں کرنا

عجیب لُطف سا ہے تتلیوں کے پیار میں قیسؔ
وہ پھول پھول سے ملنا گزارشیں کرنا

جب بھی وہ دل کے دریچوں سے صدا دیتا ہے
حوصلے اور بھی کچھ دل کے بڑھا دیتا ہے

تیری یادوں سے شبِ ہجر سجانے والے
سو بھی جائیں تو ترا درد جگا دیتا ہے

اُس کو آتا نہیں رنگوں کی ملاوٹ کرنا
بات کرتا ہے تو تصویر بنا دیتا ہے

زخم جس شخص نے ہنس ہنس کے دِیے تھے مجھ کو
آج رو رو کے وہ آنچل کی ہوا دیتا ہے

حرف کرتا ہے عطا جس کے قلم کو ادراک
اُس کو انداز بھی لکھنے کا نیا دیتا ہے

قیسؔ پھر کوئی خزانہ نہیں مِلتا اُس کو
جب کوئی درد کی سوغات گنوا دیتا ہے

اس سے پہلے میں نے یہ کب سوچا تھا
دل سے دل کا کتنا سچا رشتا تھا
میں تو سارا قیس لہو میں ڈوب گیا
اس نے تو بس شیشہ توڑ کے دیکھا تھا

خُمار دیتا مجھے اور مست کر دیتا
وُہ چاہتا تو مُجھے سبز بخت کر دیتا

کِرن کِرن سے اُجالے کی بھیک مانگتے ہیں
وہ چاند تھا تو کوئی بندوبست کر دیتا

وہ میری سلطنتِ دِل اُجاڑنے والا
مرے حوالے مرا تاج و تخت کر دیتا

سفر میں سَر کے لئے چھاؤں بھیجتا مُجھ کو
مرے جنوں کو تناور درخت کر دیتا

وہ آپ آ کے سُناتا مُجھے نویدِ ظفر
مرے حریف کے حق میں شکست کر دیتا

خُمار سُود میں کوئی زیاں نہیں کرتا
وہ میرے حوصلے ایسے نہ پُست کر دیتا

جب اُس نے سوچ کو پتھر ہی کر لیا ہے تو قیسؔ
مُجھے بھی سنگ کے مانند سخت کر دیتا

یہ مت پوچھو کیا دیکھا ہے
چاند سا اِک چہرا دیکھا ہے

پھولوں کے منظر دیکھے ہیں
کلیوں کو ہنستا دیکھا ہے

دل میں ایک کِرن پھوٹی ہے
چھت پر اِک تارا دیکھا ہے

جس پر اُس کا نام لکھا تھا
سارا پیڑ ہرا دیکھا ہے

ہم بھی تو آنکھیں رکھتے ہیں
ہم نے بھی دریا دیکھا ہے

آگ ہے آگ، اِسے مت چھونا
ہم نے ہاتھ جلا دیکھا ہے

قیسؔ یہ کب سے سوچ رہا ہوں
اُس کھڑکی میں کیا دیکھا ہے

خیال یار سے روشن جگر کا داغ ہوا
پھر آئی شام تو مَیں صاحبِ چراغ ہوا

وہ سبز بخت دریچے میں پھر نہیں آیا
بھری بہار میں کچھ ایسے بے سراغ ہوا

خراب کر گئی اُس کو ہوا زمانے کی
جوان ہونا تھا اُس کا کہ بد دماغ ہوا

کٹھن تو تھی رہ منزل تمہاری یاد کی خیر
یہ روز و شب کا سفر بھی ہمیں فراغ ہوا

نہ زلفِ یار کی خوشبو، نہ مے، نہ جام، نہ چاند
کسے بتائیں کہ ویران دل کا باغ ہُوا

نفس نفس مجھے سیراب کرنے آیا ہے
وہ کُنج لب جو مرے واسطے ایاغ ہوا

پھر آج ان سے ملے ہیں تو کیا بتائیں قیسؔ
نظر بھی شاد ہوئی دل بھی باغ باغ ہوا

اونچائی کے دام بہت ہیں
دیواریں بدنام بہت ہیں

ایک ہی دُکھ ہے سب کے دل میں
پر اس دُکھ کے نام بہت ہیں

اُس لڑکی کو دل مت دینا
دل والے ناکام بہت ہیں

آج ترا پیغام آیا ہے
آج ہی مجھ کو کام بہت ہیں

دامن دامن تر دیکھیں گے
دریا کا منظر دیکھیں گے

سُورج نکلا تو وہ آنکھیں
پتّے پتّے پر دیکھیں گے

ہم جو دل میں سوچ رہے ہیں
تیری خاطر کر دیکھیں گے

وہ آجائے تو ہم دونوں
چل کر چاند نگر دیکھیں گے

ہجر کی راتیں اتنی لمبی
کِتنے لوگ سحر دیکھیں گے

آنکھیں اچھی ہوجائیں تو
پھر ہم اپنا گھر دیکھیں گے

قیسؔ اُسے مڑ کر مت دیکھو
سارے لوگ اُدھر دیکھیں گے

چُپ کی عادت کب چھوڑو گے
باتیں کرنے کا کیا لو گے

چھت کو کیا تکتے رہتے ہو
آنکھیں پتّھر کی کر لو گے

تم تو کرامت والے ہونا!
کیا دیواریں چاٹ سکو گے

سب کا سونا تول چکے ہو
اپنی مٹی کب تو لو گے

وہ تو دل کو دُکھ ہی دے گا
بابا اُس کا کیا کر لو گے

سائے کا پیچھا کرتے ہو
سب کچھ قیسؔ گنوا بیٹھو گے

بیٹھے بیٹھے کھو جاتا ہوں
شام سے پہلے سو جاتا ہوں

آنکھیں شیشے کی کر لوں تو
خود پتھر کا ہو جاتا ہوں

جو آنکھوں کے پاس نہیں ہیں
وہ رونے بھی رو جاتا ہوں

ماں کا گھر جب یاد آتا ہے
تو مَیں پاگل ہو جاتا ہوں

قیسؔ ذرا سی آنکھ لگے تو
لاکھوں سپنے بو جاتا ہوں

❁

دَرِ جاناں پہ ہم جاتے رہے آہستہ آہستہ
عجب اُس گھر کے دَروازے کُھلے آہستہ آہستہ

تغافل کی نظر بھی تھی عنایت کے حَوالے سے
ہمارے حوصلے بڑھتے گئے آہستہ آہستہ

وہ اپنی منزلوں پر بھی پہنچ کر اک سفر میں تھا
ہم اُس کی راہ پر چلتے رہے آہستہ آہستہ

ہمارے موسموں کی خشک سالی کھا گئی ہم کو
ترے بادل برستے ہیں بڑے آہستہ آہستہ

مِری راتوں کی نیندیں دفعتاً اُڑنے لگیں لیکن
تِری آنکھوں تک آئے رتجگے آہستہ آہستہ

مُجھے بُجھتے ہوئے دیکھا تو روشن کر دیا اُس نے
دِیے میرے لبوں پہ رکھ دِیے آہستہ آہستہ

سُنائی کچھ نہیں دیتا اِتنا شور تھا دِل میں
نہ جانے لوگ کیا کہتے رہے آہستہ آہستہ

سفر کا آخرِ شب ہم ارادہ قیسؔ کیا کرتے
وہ سارے قافلے ہی لُٹ گئے آہستہ آہستہ

محبت روشنی ہے

سعید قیس

فہرست

غزلیں

……o……

سعید قیس کی شاعری

سعید قیس کی کتاب ''دیوار و در'' کے فلیپ میں۔ میں نے لکھا تھا کہ:

''سعید قیس کا کلام گاہے بگاہے میری نظر سے گزرا ضرور تھا لیکن ایک خوشگواری کے سے احساس کے سوا اس کا کوئی مستقل تاثر قائم نہ ہو سکا تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ یہ شخص کون ہے، کہاں ہے، کیسا ہے، اور کب سے لکھتا ہے جنوری ۹۴ء میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں بحرین جانا ہوا تو وہاں ہر شخص کی زبان پر اُن کا نام تھا اور سب لوگ انہیں بحرین کا سب سے معتبر شاعر ماننے کے ضمن میں یک زبان تھے۔ ابھی میں اس بات پر ہی خوش ہو رہا تھا کہ چلو اہل وطن، وطن سے دور ہی سہی، کسی بات پر متفق تو ہوئے کہ سعید قیس سے ملاقات ہوگئی اور چند ہی منٹ میں یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس شخص سے ملاقات تو برسوں پر پھیلی ہوئی ہے، ایسا دھیما، ایسا مدھم، ایسا پیارا انسان اور پھر ایسا عمدہ اور گہرا شاعر:

سعید قیس اُن شاعروں میں سے ہیں جن کا کلام اُن کے اپنے منہ سے سننا ایک علیحدہ معنی رکھتا ہے، بیان کی سادگی، آواز کا ٹھہراؤ اور ایک عجیب سی اداسی ملی بے نیازی، سعید قیس کے لہجے کی وہ خوبیاں ہیں جو سننے والے کو بے حد متاثر کرتی ہیں۔ معنوی اعتبار سے سعید قیس کی غزل میں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ساتھ غزل کے جدید آہنگ کا لحن اور بازگشت کچھ ایسے یک جان ہو گئے ہیں کہ اُن کے مصرعے دماغ میں کوندتے اور دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔''

اس اجمالی سے تاثر میں اگرچہ سعید قیس کی شاعری کی بیشتر بنیادی خصوصیات کا

ذکر ہو گیا ہے لیکن دریا کوزے میں سمٹ نہیں پایا اس پر مستزاد یہ کہ اس دوران میں مجھے اُن کی نئی اور پرانی شاعری کے مطالعے کا موقع ملا ہے اور یوں ان کے بارے میں کہنے کی اور بہت سی باتیں بھی تفصیلی اظہار کی متقاضی ہو گئی ہیں۔ سعید قیس کی شاعری اور شخصیت، دونوں میں، مولانا حالی کے ساتھ ایک خاص طرح کی مماثلت پائی جاتی ہے وہ سرتاپا ایک شریف النفس، دھیمے اور بھلے مانس انسان ہیں اور اُن کی شاعری میں ایک ایسی سادگی ہے جو دلفریب بھی ہے اور دلگداز بھی۔

یوں تو چھوٹی بحر اور سہل ممتنع کے انداز میں کہی گئی غزل ہر اہم اور بڑے غزل گو کے یہاں ایک سے ایک نئے رنگ اور انداز میں جلوہ نما دکھائی دیتی ہے لیکن دورِ حاضر میں جن شاعروں نے اسے زیادہ خوبی اور کامیابی سے برتا اور نبھایا ہے ان میں ناصر کاظمی، باقی صدیقی، جون ایلیا اور محبوب خزاں کے ساتھ ساتھ سعید قیس کا نام بھی آتا ہے وہ بہت ہی مختصر الفاظ اور انتہائی سادہ انداز میں ایسی باریک، خوب صورت اور دل کو چھو لینے والی باتیں ایسے منفرد غنائی انداز میں کر جاتے ہیں کہ شعر کے الفاظ نثری ترتیب سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی اعلیٰ درجے کی موسیقیت کا تاثر قائم کرتے ہیں اور ابلاغ کا سرا کہیں بھی ہاتھ سے نکلتا دکھائی نہیں دیتا۔ میر نے کہا تھا:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

یہاں یہ واضح کرنا بہت ضروری ہے کہ میر کے یہ "عوام" کارل مارکس کے فلسفے والے عوام نہیں تھے کہ جن کی وجہِ تخصیص صرف ان کی غربت مفلسی اور معاشی بدحالی ہو۔ ہماری کلاسیکی شاعری میں یہ لفظ بہت وسیع معانی کا حامل ہے جو اپنا ایک الگ اور مخصوص تہذیبی پس منظر رکھتا ہے، سعید قیس کی شاعری کے منظر نامے میں بھی اُن کے مخاطب کچھ اسی قسم کے عوام ہیں۔ ایسے عوام جن سے شاعر اپنی پوری جان کے

ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے یہاں صیغہ واحد متکلم میں بھی اکثر و بیشتر جمع متکلم کی آہنگِ بازگشت سنائی دیتی ہے اور اس کا ''ہم'' جگہ جگہ ''مَیں'' میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

تو نے جس دشت میں رکھا مجھے سائے کے بغیر
خوب میں نے بھی وہاں خاک اڑائی، مولا

یاد رکھتا ہے سدا قیس مجھے میرا خدا
جو مجھے میری طلب سے بھی سوا بھیجتا ہے

ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے لیکن
ہماری آرزو کتنی بڑی ہے

زخم کھایا ہے تو روتے کیوں نہیں
پاؤں میں چُبھتی نہیں زنجیر، کیا!

نہ جانے کب کوئی کس راستے سے آ جائے
دیے جلا کے دریچے میں چار سُو رکھنا

یہی تو وصف ہے ہم نامراد لوگوں کا
زمیں پہ رہنا نظر آسمان میں رکھنا

وہ جس کے ہونے سے ملتا ہے منزلوں کا سُراغ
اک ایسا شخص بھی تم کاروان میں رکھنا

سب کی ہتھیلیوں پہ دیے تھے شبِ فراق
سب جل رہے تھے اور منور کوئی نہ تھا

دِل کے گلدستے میں رکھے تھے تری یادوں کے پھُول
بے خیالی جانے کب اُن کو چُرا کر لے گئی
میں تو جاتا ہی نہیں تھا قیسؔ اُس کے شہر میں
پر محبت مجھ کو سینے سے لگا کر لے گئی

بچّے مری گلی کے بہت ہی شریر ہیں
پھر آج تیرا نام درختوں پہ لکھ گئے

کبھی کبھی تو محبت دکھائی دیتی ہے
کبھی کبھی ہمیں اپنا پتا نہیں ہوتا

سنائی کچھ نہیں دیتا تھا اتنا شور تھا دل میں
نہ جانے لوگ کیا کہتے رہے آہستہ آہستہ

لطف کی بات یہ ہے کہ خود سعید قیسؔ کا اپنا لہجہ، اندازِ بیاں اور طرزِ ادا بھی ایک

ایسی آہستہ روی کے مظہر ہیں کہ اُن کی بات کو اگر مکمل توجہ کے ساتھ سنا اور سمجھا نہ جائے تو اس کا بہت سا حصہ ان سنا رہ جاتا ہے۔ اُن کی چھوٹی بحر کی بیشتر غزلوں میں اُن کی یہی آہستہ روی ہے جو بنا آواز کیے چُپ چاپ قاری کے دل میں اُترتی چلی جاتی ہے اور بعض اوقات معنی کی تفہیم سے بھی پہلے محض اپنی اس خوبی کے باعث اظہار کے کئی مرحلے سر کر جاتی ہے۔ وہ غالب کے مطلوب مغنی آتش نوا نہ ہوتے ہوئے بھی برقِ فنا کا ایک ایسا جلوہ دکھا جاتے ہیں کہ اہلِ دِل یکبارگی جل کر بھسم ہونے کے بجائے ایک اندر ہی اندر سلگتی ہوئی آگ کے خس وخاشاک کی طرح دھیرے دھیرے لیکن مسلسل جلتے رہتے ہیں۔ چھوٹی بحر کی یہ غزلیں میرے خیال میں سعید قیس کا سب سے موثر ہتھیار ہیں۔ ایک ایسا ہتھیار جو کلہاڑے کی طرح دو ٹکڑے نہیں کرتا بلکہ ایک ماہر مینا کار کے اوزاروں کی طرح آہستہ آہستہ کاٹتا اور تراشتا رہتا ہے۔

چُپ کی عادت کب چھوڑو گے!
باتیں کرنے کا کیا لو گے!

سب کا سونا تول چکے ہو
اپنی مٹی کب تو لو گے!
وہ تو دل کو دکھ ہی دے گا
بابا، اُس کا کیا کر لو گے!

قیس اُسے مڑ کر مت دیکھو
سارے لوگ اُدھر دیکھیں گے

ایک ہی دُکھ ہے سب کے دل میں
پر اِس دُکھ کے نام بہت ہیں
ہم ہی تنہا رہ گئے اُن کے بغیر
اور دنیا میں کسی کا کیا گیا!

تھوڑا تھوڑا تم جیسا ہے
چاند مجھے اچھا لگتا ہے
سائے کس کے کام آئے ہیں؟
دیواروں میں کیا رکھا ہے!

دِل پتھر کا گھر ہے، جس میں
شیشے کا سامان بہت ہے

مر مر کر ہم جی لیتے ہیں
اللہ کا احسان بہت ہے

قیسؔ ہم تعمیرِ دل کرتے رہے
غم ہمیں اندر ہی اندر کھا گیا

قیسؔ یہ سوچ رہا ہوں کب سے
میرے گھر میں مرا اپنا کیا ہے!

بہت ویران کر جاتا ہے مجھ کو
پرندوں کا درختوں پر نہ ہونا
بری عادت ہے لیکن پڑ گئی ہے
خود اپنے گھر میں رہ کر گھر نہ ہونا
تم اپنے بوجھ ہی سے دب نہ جاؤ
کہیں اتنے بھی طاقت ور نہ ہونا

مسئلہ تو ہے انا کا بابا
میرے اندر کی بلا کا بابا
یہ محبت جو لیے پھرتے ہو
ایک جھونکا ہے ہوا کا بابا

ہم تو چڑیوں کی طرح ہیں کہ ہمیں
شام کو لوٹ کے گھر جانا ہے

آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ ان تمام اشعار میں جو سادگی و پرکاری، تعلق و بے

نیازی اور وسعت و گہرائی پہلو بہ پہلو چل رہی ہے۔ وہ دیکھنے میں جتنی آسان نظر آتی ہے حقیقت میں اتنی ہی مشکل ہے۔ غزل میں عام طور پر کہی گئی بات، ان کہی کا محض ایک اشارہ اور تعارف ہوتی ہے لیکن یہ اگر ذرا سی مبہم یا ضرورت سے تھوڑی سی بڑھ جائے تو کلام کا لطف آدھا رہ جاتا ہے۔ سعید قیس اس نازک فرق کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ ایک ماہر بیٹسمین کی طرح ہیں جو اس راز کو بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ زیادہ اور لمبا سکور کرنے کے لیے خراب گیندوں پر ہٹ مارنے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اچھے گیندوں کو کیسے کھیلا اور چھوڑا جائے!

سعید قیس کی غزل یوں تو اُردو غزل کی روایت کے ایک مخصوص حصے میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ جدید لہجے، خیالات اور پیرایوں سے متعارف اور آشنا نہیں یا ان کے ساتھ چل نہیں پاتے میرے خیال میں یہاں بھی اُن کی فطری میانہ روی اور ''مروّت بنیاد صلح پسندی'' ہی انہیں ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی لیکن جہاں کہیں انہوں نے اس پاسبان کو تنہا چھوڑا ہے اُن کی غزل میں ایسے رنگ بھی در آئے ہیں جنہیں بآسانی جدید لہجے کی حامل غزلوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً اس شعر میں لفظ ''بندوبست'' کا استعمال دیکھیے۔

کرن کرن سے اُجالے کی بھیک مانگتے ہیں
وہ چاند تھا تو کوئی بندوبست کر دیتا

اور یہاں ''محلے والوں'' کے ذکر میں جو روانی اور بے ساختگی ہے اس کا ایک اپنا ہی لطف ہے۔

نام ہوا بدنام محلے والوں کا
گھر کو ہم نے خود ہی آگ لگائی تھی

اب اگر اس سیدھے سادے اور صُلح کل شعر سے آپ کا دھیان اپنے ملکی و قومی

آشوب کی طرف چلا جائے تو اس میں بے چارے سعید قیس کا کیا قصور ہے!

جدید لہجے اور جدیدیت کے حوالے سے اُن کی یہ غزل خاص طور پر لائقِ غور ہے

انہی کو آتا ہے ایسا کمال کر رکھنا
ہر ایک دل کو ہوا میں اُچھال کر رکھنا
یہ دھوپ شہر میں خیمے لگا کے چھوڑے گی
مرے لیے کوئی سایا سنبھال کر رکھنا
عجب نہیں کہ میں عیسیٰ کے روپ میں آؤں
تم اپنے گھر سے صلیبیں نکال کر رکھنا
اب اس سے بڑھ کے بھی کوئی عذاب کیا ہوگا
کسی کے دل میں تمنائیں ڈال کر رکھنا

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ اگرچہ ہر فن کے اہل ہنر اپنے اپنے عرصۂ حیات میں تسلسل اور کثرت کے اعلیٰ درجے کا فن تخلیق کرتے رہتے ہیں لیکن اُن کا کوئی ایک شاہکار ایسا ہوتا ہے جو مقبولیت کی سرحدیں عبور کرتا ہوا اُن کی پہچان بن جاتا ہے میں ذاتی طور پر اس مقبولیت کو ''قبولیت'' کا ایک مظہر قرار دیتا ہوں کہ یہی وہ ''کرشمہ''، ''جوہر''، ''برکت'' یا ان دیکھا اضافہ ہے جو کسی ایک فن پارے کو اپنے جیسے ہزاروں میں منفرد اور ممتاز کر دیتا ہے سو آخر میں آپ کی توجہ سعید قیسؔ کی ایک ایسی ہی غزل کی طرف منعطف کرانا چاہوں گا جو میرے نزدیک اُن کی پہچان بن چکی ہے:

دل کو سیراب کیا اور نہ پیاسا رکھا
ہم نے دریا سے عجب جبر کا رشتہ رکھا
شوق اُس کو بھی تھا بھیڑ میں کھو جانے کا
جانے کیا سوچ کے اُس نے مجھے تنہا رکھا
تیری سانسوں کی مہک آئے جہاں سے آئے
ہم نے دیوار میں ہر سمت دریچہ رکھا
عزم رکھے تو فصیلوں کے سروں پر رکھے
زخم رکھا تو سمندر سے بھی گہرا رکھا
جس کی گہرائی میں ہم ڈوب سکیں، مر بھی سکیں
ہم نے آنکھوں میں وہ دریا تو ہمیشہ رکھا
یہ بجا دُودھ کی نہریں نہ بہائیں ہم نے
یہ کہو، ہاتھ سے کب ہم نے یہ تیشہ رکھا
روشنی مجھ کو بلانے مرے گھر تک آئی
اُس نے دیوار پہ مٹی کا دیا، کیا رکھا
مجھے اک دن کسی سائے کے حوالے سے بھی دیکھ
سوکھ جاؤں گا یونہی دُھوپ میں رکھا رکھا
قیسؔ ہی رکھ لیا جب ہم نے تخلص اپنا
کُنجِ آغوش میں اک دامنِ صحرا رکھا

یہ کتاب ایک اعتبار سے سعید قیسؔ کا ایک نیا شعری مجموعہ بھی ہے اور اُن کے

''محبت روشنی ہے'' اور سعید قیسؔ

بزرگ شاعر سعید قیسؔ کا شمار خلیجی ریاستوں میں مقیم نمایاں اردو شعراء میں سر فہرست ہوتا ہے۔ ''محبت روشنی ہے'' اُن کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں اُن کے تیسرے مجموعے ''دیوار ودر'' (مطبوعہ مئی ۱۹۹۴ء) سے بھی بعض غزلیں اور قطعات بھی ہیں جن کے کئی اشعار کتاب کی ان غلطیوں سے پاک کر دیے گئے ہیں جو ''دیوار ودر'' میں رہ گئی تھیں۔ زیر نظر کتاب میں جناب قیسؔ کی تقریباً پچاس نئی غزلیں اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں نئے قطعات بھی شامل ہیں۔ موصوف گزشتہ ۴۳ سال سے بحرین میں مقیم ہیں اور کہنہ سالی کے باوجود جدید لب و لہجے کے شعر کہنے میں شہرت رکھتے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں نہ صرف ان کے شعری تجربات تمام تر پختگی کے ساتھ سامنے آئے ہیں بلکہ گزشتہ مجموعوں کی اشاعت کے سلسلے میں انہیں جو تجربات ہوئے ہیں ان کی روشنی میں بھی انہوں نے اس کتاب کو خوب سے خوب تر بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ خوش قسمتی سے اس عمل میں ''الحمد'' کے جناب صفدرؔ حسین کی خوش سلیقگی بھی شامل ہوگئی ہے۔ اس بنا پر اُمید ہے کہ یہ شعری مجموعہ قارئین کو بہت زیادہ محفوظ کرے گا۔

اس کتاب میں نامور شاعر جناب امجد اسلام امجدؔ کا مفصّل دیباچہ جناب قیسؔ کے فن کی تفہیم کے لیے اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ جناب امجدؔ نے اس کتاب کی ترتیب و تشکیل میں بھی اگر انقدر آراء سے نوازا ہے۔ سونے پہ سہاگہ کہ یہ مجموعہ عہد حاضر

شعری کلیات کا انتخاب بھی کہ اس میں اُن کی بہت پہلے چھپنے والی کتاب ''ہجر کے موسم'' کا کچھ حصہ اور ''دیوار ودر'' کا بیشتر کلام شامل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سارا نیا کلام بھی شامل ہے اور ترتیب میں بھی ایسا التزام رکھا گیا ہے کہ ساری غزلیں ایک جگہ ہوں اور تمام قطعات غزلوں کے آخر میں ایک ساتھ درج کر دیے جائیں۔ مجھے امید ہے اُردو شاعری کے قارئین اس کتاب کو پڑھ کر ایک ایسی ہی حیرت آمیز خوشگوار مسرّت سے دوچار ہوں گے جیسی زندگی میں کسی اعلیٰ اور غیر معمولی انسان سے اچانک ملاقات پر محسوس ہوتی ہے۔

امجد اسلام امجد

کے معتبر ترین شاعر جناب احمد ندیم قاسمی کے بیک ٹائیٹل فلیپ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس سارے عمل میں کتاب کے حُسن میں جو دو چند، سہ چند اضافہ ہوا ہے، قارئینِ کرام یقیناً اس سے خوشگوار تاثر لیں گے۔

محمد ممتاز راشد

جنوری ۱۹۹۷ء

غزلیں

تنکا ہوا کے سامنے آیا تو ڈٹ گیا
سارے غموں کا بوجھ مرے دل سے ہٹ گیا

یہ تو ترے جمال کی نیرنگیاں ہی تھیں
میں ایک اور لاکھ خیالوں میں بٹ گیا

صحرا کی وسعتوں سے بڑا ڈر لگا مجھے
پھیلا جو میں تو اپنے ہی اندر سمٹ گیا

ہم اہل احتیاط بھی تھے اہل ہوش بھی
وہ شخص تو بساط ہی دل کی الٹ گیا

جب بھی کبھی کسی نے اسے بیوفا کہا
میرا وقار خود مری نظروں میں گھٹ گیا

ان سے بچھڑ کے قیسؔ کچھ ایسا لگا مجھے
جیسے میرا وجود ہی خود مجھ سے کٹ گیا

اسیر جاں تھی تمنا، دہائی کیا دیتی
بریدہ پر کو نوید رہائی کیا دیتی

مجھے بھی کچھ نہ دیا رتجگوں کی عادت نے
اسے بھی دن کی مشقت کمائی کیا دیتی

اسے تو داغ جگر بھی نظر نہیں آتا
پھر اس کو پھول کی خوشبو دکھائی کیا دیتی

گرفتۂ دل تھے شکایت بھی تم سے کیا کرتے
بجز ملال ہمیں آشنائی کیا دیتی

حصار ذات ہی تو قیسؔ مسئلہ تھا میرا
شعاع مہر بھی مجھ کو رہائی کیا دیتی

دل میں اک ارمان بہت ہے
ایک کرن کا دھیان بہت ہے

آنکھیں اچھی ہو جائیں تو
چھوٹی سی پہچان بہت ہے

دل ایسا پتھر ہے جس میں
شیشے کا سامان بہت ہے

ہم بے قیمت، ہم آوارہ
وہ رکھ لے تو مان بہت ہے

پہلے دل ویران ہوا تھا
اب گھر بھی ویران بہت ہے

مر مر کر ہم جی لیتے ہیں
اللہ کا احسان بہت ہے

مشکل مشکل کیا کرتے ہو
مشکل تو آسان بہت ہے

جی سکتے ہو قیسؔ تو جی لو
مرجانا آسان بہت ہے

یہی جلدی ہے کہ جلدی سے ٹھکانے لگ جائیں
ورنہ شاید ہمیں مرنے میں زمانے لگ جائیں

یہ اداسی مری آنکھوں کی مجھے چاٹ نہ لے
میرے گھر میں کبھی مہمان جو آنے لگ جائیں

ہم بھی کیا لوگ ہیں اک زخم ہنر کی خاطر
دن نکلتے ہی چراغوں کو جلانے لگ جائیں

ابر برسے تو سلگنے لگیں تل تل آنکھیں
اور کڑی دھوپ کی بارش میں نہانے لگ جائیں

وحشت ہجر کی ارزانی سے تنگ آئے ہوئے
لوگ شاخوں سے پرندوں کو اڑانے لگ جائیں

کوئی صورت کسی تجدید وفا کی بھی تو ہو
ورنہ پھر سے نہ ہمیں روگ پرانے لگ جائیں

میرے مولا وہ زمیں پھر مجھے واپس کر دے
پھر مرے پاؤں مرا بوجھ اٹھانے لگ جائیں

یوں بھی ہوتا ہے کہ ہر روز دعا مانگتا ہوں
میرے بادل ہی مجھے آگ لگانے لگ جائیں

یہ بھی ممکن ہے بہانہ کوئی مل جائے انہیں
لوگ مجھ پر کوئی احسان جتانے لگ جائیں

تیرے آنچل کی ہواؤں سے میں سرشار تو ہوں
اور کسی دن جو مری خاک اڑانے لگ جائیں

یہ شرر راکھ میں شعلہ ہی نہ بن جائے کہیں
چلو! ہم آج ہی سے آگ بجھانے لگ جائیں

قیسؔ کس نام سے اپنوں کو پکارے کوئی
میرے رستے میں اگر خار بچھانے لگ جائیں

راکھ پر زائچے بناتے ہیں
ہم بھی کیا دائرے بناتے ہیں

دل کو ویران کر لیا ہے تو اب
آنکھ میں راستے بناتے ہیں

ہم تو اڑتے ہوئے پرندے ہیں
ہم کہاں گھونسلے بناتے ہیں

وہ ہمیں ڈوبنا سکھا دے گا
اس لیے ہم گھڑے بناتے ہیں

ذوق تعمیر انگلیوں میں ہے
ہم ہوا سے دیے بناتے ہیں

جب بناتے ہیں دل میں گھر اس کا
ہم بڑے شوق سے بناتے ہیں

یہ دریچے، یہ در، یہ دیواریں
آپ کے واسطے بناتے ہیں

جب سے صحرا میں بس گئے ہیں قیسؔ
گھر بھی ہم ریت کے بناتے ہیں

❁

شام کے ڈھلتے ہی آ جانا پھر سوچیں گے
پھر ملنے کا کوئی بہانہ، پھر سوچیں گے

میں کوئی تصویر بنانے لگ جاؤں گا
تم رنگوں میں رنگ ملانا، پھر سوچیں گے

چلتے چلتے گھر سے دور نکل جاؤں میں
اور تم میرے ساتھ نہ آنا پھر سوچیں گے

کس نے کس کو کس کی خاطر کیوں چھوڑا تھا
کوئی شکوہ ساتھ نہ لانا پھر سوچیں گے

آؤ مل کر دل کا جشن منا لیتے ہیں
پھر کیا ہوگا؟ پھر سمجھانا، پھر سوچیں گے

ممکن ہو تو وقت سے پہلے ہی آجانا
وقت سے پہلے ہی آجانا پھر سوچیں گے

آنکھوں سے دل کی بستی تک ایک گلی ہے
گھر کا رستہ بھول نہ جانا پھر سوچیں گے

میں ہی قیسؔ نشانے پر دل کو رکھ دوں گا
تم ہی پہلا تیر چلانا پھر سوچیں گے

❁

راستے ہی میں رہ گیا ہوگا
کوئی جھونکا شمال کا ہوگا

اس نے حیران کر دیا ہے مجھے
سوچتا ہوں وہ شخص کیا ہوگا

لوٹ کر تو ضرور جانا ہے
وہ مری راہ دیکھتا ہوگا

اس قدر تو یقین ہے مجھ کو
وہ دریچہ ابھی کھلا ہوگا

آنکھ ویران ہوگئی ہے تو کیا
اس کا دل بھی تو بجھ گیا ہوگا

وہ اکیلا کبھی گیا ہی نہیں
شہر میں اب رہا بھی کیا ہوگا

چاند بھی روز ڈوب جاتا ہے
اس کے ہاتھوں میں بھی گھڑا ہوگا

جو بھی ہوگا پسِ درد و دیوار
قیسؔ وہ شخص چاند سا ہوگا

❁

ہر روز نئے خواب دکھا دیتی ہیں آنکھیں
میلے مری آنکھوں میں لگا دیتی ہیں آنکھیں

بھولے سے اگر کوئی گزر جائے ادھر سے
چڑیوں کی طرح شور مچا دیتی ہیں آنکھیں

ہر روز ترے نام سے چلتی ہیں ہوائیں
ہر روز مری خاک اڑا دیتی ہیں آنکھیں

چپکے سے مرے دل میں اتر جاتا ہے سورج
چپکے سے مجھے مجھ سے چھپا دیتی ہیں آنکھیں

شب بھر مجھے سونے کی اجازت نہیں دیتیں
دن کو مجھے سولی پہ چڑھا دیتی ہیں آنکھیں

میں اپنے حوالے کی نفی کیسے کروں قیسؔ
مجھ کو ترے منظر میں سجا دیتی ہیں آنکھیں

✿

یہ مری گیلی لکڑیاں جو ہیں
روز راتاں کو جلتیاں جو ہیں

زخم دل کا ہرا ہی رہتا ہے
یہ مری سبز ڈالیاں جو ہیں

نیند پھر عمر بھر نہیں آئی
عمر بھر کی جدائیاں جو ہیں

کہکشاں نے لکیر کھینچی ہے
تیری بانہوں میں چوڑیاں جو ہیں

چاند کی بیٹیاں ہیں دھرتی پر
یہ محلے کی لڑکیاں جو ہیں

مٹھیاں کھولنے سے ڈرتا ہوں
میرے ہاتھوں میں تتلیاں جو ہیں

اب انہیں انتظار کس کا ہے
وہ حویلی کی کھڑکیاں جو ہیں

دل نے رسوا تو قیس ہونا تھا
عادتاں ہم نے ڈالیاں جو ہیں

✿

دل گرفتہ تھے، گرفتار نہ تھے
ہم بھی کیا لوگ تھے عیار نہ تھے

بھیڑ میں وہ بھی اکیلا نہ گیا
ہم بھی تنہا سربازار نہ تھے

کچھ تو غربت کی فضا راس نہ تھی
کچھ وہاں روزن دیوار نہ تھے

چاند بھی اس کی جبیں سے نکلا
پھر بھی روشن مرے آثار نہ تھے

ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا سورج
ہم درختوں کے طلبگار نہ تھے

کیسے لمحوں کے سفر میں تھی نظر
جو کبھی حاصل دیدار نہ تھے

میں تو مجبور تھا، میں کیا کرتا
تم بھی تو میرے خریدار نہ تھے

آنکھ دہلیز پہ جا بیٹھی تھی
دور تک شام کے آثار نہ تھے

تیرنا بھی تھا گھڑے پر ان کو
ڈوبنے کو بھی وہ تیار نہ تھے

قیسؔ وہ پاس وفا کیا کرتے
ہم بھی تو صاحب کردار نہ تھے

سخن کے چہرے پہ رنگ ہنر تو رہنا تھا
ہماری شاخ غزل پر ثمر تو رہنا تھا

یہ میرے جسم پہ آنکھوں کی کشتیاں جو تھیں
کسی بھنور کا مرے جی میں ڈر تو رہنا تھا

تجھے تلاش نہ کرتے تو اور کیا کرتے
یہ جبر ذات یہ اذن سفر تو رہنا تھا

وہ شہر چھوڑ کے جاتا اگر تو مر جاتا
ترا ملال اسے عمر بھر تو رہنا تھا

ہم اپنے دشت سے صرف نظر بھی کیا کرتے
ہوا کے ساتھ ہمیں دربدر تو رہنا تھا

تمہارے قرب کی خوش فہمیاں ہی ایسی تھیں
جدائیوں کا ذرا سا اثر تو رہنا تھا

بصیرتوں کا بھی ہم پر عذاب تھا ورنہ
ہمیں خبر تھی ہمیں بے خبر تو رہنا تھا

چراغ شب کی لویں ہوں کہ صبح نو کا جمال
ہماری راکھ میں کوئی شرر تو رہنا تھا

ہم اپنی ذات سے باہر بھی قیسؔ کب نکلے
نظر میں اس کی گلی اس کا گھر تو رہنا تھا

دیواروں میں بھی چنوایا جاسکتا ہے
زخم کو دل میں بھی دفنایا جاسکتا ہے

جس سے مل کر خوشبوؤں کی یاد ستائے
اس کے دل میں باغ لگایا جاسکتا ہے

پتھر کاٹ کے نہر بہانے کیوں نکلے ہو
شیشہ توڑ کے کام چلایا جاسکتا ہے

پہلے دل میں ایک افق تیار تو کر لو
چاند کہیں سے مانگ کے لایا جاسکتا ہے

اس کو دل کی بات بتانی مشکل ہو تو
اپنے اندر شور مچایا جاسکتا ہے

ہم جو دل میں خواہش کا اک پیڑ لگا دیں
اس کے آنگن تک بھی سایا جاسکتا ہے

اس کی خاطر ساری گلیاں چھان چکا ہوں
اب تو سارا شہر جلایا جاسکتا ہے

جس نے اس کو چھو کر بھی نہ دیکھا ہو تو
اس پاگل کو کیا سمجھایا جاسکتا ہے

اس بارش میں دھوپ کہیں سے آ نکلے تو
آنکھوں کا تہوار منایا جاسکتا ہے

ہر اک شخص زباں رکھتا ہے اس دنیا میں
کوئی بھی الزام لگایا جاسکتا ہے

میں بھی مردہ حرف کو زندہ کرسکتا ہوں
مجھ کو بھی سولی پہ چڑھایا جاسکتا ہے

ایسا سحر ایجاد کیا ہے ہم لوگوں نے
پھول نہیں تو زخم اگایا جاسکتا ہے

قیسؔ غزل کا مان بڑھانا ممکن ہو تو
لفظوں کا انبار لگایا جاسکتا ہے

آنکھ میں کاجل ہوتا نہیں
اب میں پاگل ہوتا نہیں

پینا وینا چھوڑ دیا
بادل وادل ہوتا نہیں

جب سے اس کو دیکھا ہے
چہرہ جنگل ہوتا نہیں

موسم آتے جاتے ہیں
زخم مکمل ہوتا نہیں

اندر لاکھ دراڑیں ہوں
ماتھے پہ بل ہوتا نہیں

میں بھی ایک معمہ ہوں
برسوں میں حل ہوتا نہیں

سایا سایا کرتے ہیں
آنچل وانچل ہوتا نہیں

قیس یہ کیسا ساون ہے
صحرا جل تھل ہوتا نہیں

تم سے مل کر جدا بھی ہونا تھا
اب تو یہ حادثہ بھی ہونا تھا

موسموں کے عذاب تھے مجھ پر
اور مجھ کو ہرا بھی ہونا تھا

میرے چہرے پہ کشتیاں جو تھیں
پھر کوئی واقعہ بھی ہونا تھا

اک دیا ہی تو تھا مری اوقات
جو سپرد ہوا بھی ہونا تھا

آج آنکھوں میں چاند ڈوب گیا
آخری معجزہ بھی ہونا تھا

قیسؔ پتھر فروش تھی بستی
اور مجھے آئینہ بھی ہونا تھا

خیال کرنا تو جینا محال کرنا ہے
مگر ہمیں یہی کار ملال کرنا ہے

ابھی بدن کسی خوشبو کے انتظار میں ہے
ابھی ہوا نے مجھے پائمال کرنا ہے

فراق یار میں جلنا کسے نہیں آتا
وصال یار میں جلنا کمال کرنا ہے

گزر بھی جا میری آنکھوں سے موسم ہجراں
کہ میں نے وصل رتوں کو بحال کرنا ہے

میں اپنے ظرف کا پابند ہوگیا تھا قیسؔ
مجھے خبر تھی کہ اس نے سوال کرنا ہے

محبتوں کے گلاب مہکے تو یاد آیا
ہماری آنکھوں سے پھول برسے تو یاد آیا

سواد شب میں کرن کرن وہ اداس چہرا
ہم آج لمبے سفر سے لوٹے تو یاد آیا

وہ ایک لمحہ وہ انبساط سفر کا لمحہ
ہم آج ان کی گلی سے گزرے تو یاد آیا

وہ قربتوں کے بسیط موسم کا نرم جھونکا
ہم اپنے اندر سے آج نکلے تو یاد آیا

درون جاں انتشار جاں کا وہ شور پیہم
ہوا سے بجنے لگے دریچے تو یاد آیا

وہ ایک منظر چناب جیسا خراب جیسا
ہم آج کچے گھڑے سے اترے تو یاد آیا

وہ شہر جاناں، وہ بند گلیاں وہ چپ دریچے
اجڑ گئے دل کے سارے رستے تو یاد آیا

وہ ایک دریا محبتوں کی عنایتوں کا
تم آج اتنے قریب آئے تو یاد آیا

تری جبیں پر چمکنے والا وہ اک ستارہ
یہ چاند چہرے زمیں پہ اترے تو یاد آیا

جو ہم نے سوچا تو قیس دل پر سنبھل سنبھل کر
بصیرتوں کے عذاب ٹوٹے تو یاد آیا

ہم نے مر مر کر گزاری زندگی
پتھروں سے بھی ہے بھاری زندگی

لہر کی صورت رواں ہیں ہجرتیں
درد کی صورت ہے جاری زندگی

اک خلا ہے زندگی کے درمیاں
اک سفر میں ہے ہماری زندگی

ہم پہ یہ الزام بھی رکھا گیا
ہم نے کاٹی ہے تمہاری زندگی

وہ گلی کا موڑ اب تک یاد ہے
بھولتی جاتی ہے ساری زندگی

پھول پر رکھی ہے شبنم کی طرح
آپ کی آنکھوں پہ واری زندگی

آرزوؤں کے شجر پھلتے رہے
ہم نے شاخوں سے اتاری زندگی

اس مذاق تشنگی کا کیا کریں
کتنی میٹھی ہے یہ کھاری زندگی

اک حصار مرگ سا ہے گردو پیش
اور آنکھوں پر ہے طاری زندگی

جب کھلونے جوڑنے لگتا ہوں قیسؔ
ٹوٹ جاتی ہے بچاری زندگی

دل کا بوٹا رہے ہرا سائیں
بھیج دے پھر کوئی ہوا سائیں

یہ جو صحرا سا تو نے بخشا ہے
اس میں اک باغ بھی لگا سائیں

کوئی حرف بسیط روشن کر
میرے شعروں میں جگمگا سائیں

دے سکے تو وہ آنکھ دے مجھ کو
نیند میں ہوں مجھے جگا سائیں

تیرتے کیوں نہیں چناب میں اب
تیری مٹی مرا گھڑا سائیں

کیوں مجھے گھورتا ہے شام و سحر
آئینے سے مجھے بچا سائیں

زندگی اور اتنی بدصورت
زخم اور اتنا خوشنما سائیں

سوچتا ہوں تو ٹوٹ جاتا ہوں
یہ محبت ہے کیا بلا سائیں

کیا کروں روز بھول جاتا ہوں
اپنے ہی گھر کا راستا سائیں

اب سفر کس لیے ضروری ہے
کب رکے گا یہ قافلہ سائیں

ہجر کی رات سر پہ آ پہنچی
دھوپ کا کوئی سلسلہ سائیں

زندگی تلخ ہوئی ہے قیسؔ
اب کوئی معجزہ دکھا سائیں

❁

ریزہ ریزہ تھا جو چہرا کیا تھا
ہم نے آئینے میں دیکھا کیا تھا

دھوپ نکلی ہے تو اب سوچتا ہوں
وہ گھنے پیڑ کا سایا کیا تھا

حرف کی تہہ میں کہیں وہ تو نہیں
فیصلہ دستِ ہنر کا کیا تھا

خاک اڑتی رہی میرے اندر
میں بکھرتا گیا میرا کیا تھا

ٹوٹتا ہوں تو بکھر جاتا ہوں
میرے حالات میں ایسا کیا تھا

اب وہ دل ہی نہیں پہلو میں تو قیسؔ
کس سے پوچھیں کہ وہ قصہ کیا تھا

ایک نمی سی ہے آنکھوں میں جھرنا ورنا کیا ہے
سوچ رہے ہیں ان زخموں نے بھرنا ورنا کیا ہے

دن نکلے تو اس کی یادیں لے کر چل پڑتے ہیں
گلیوں میں پھرتے رہتے ہیں کرنا ورنا کیا ہے

چھپ چھپ کر رونے کی عادت چھوٹ گئی ہے ہم سے
دل کے ایک ذرا سے کھیل میں ہرنا ورنا کیا ہے

تم تو دریاؤں والے ہو تم کو کیا بتلائیں
ہم نے اپنے ریت سراب میں ترنا ورنا کیا ہے

بارش کا موسم جب تھا تو سوچا ووچا کب تھا
اب دل دل کا برتن ورتن بھرنا ورنا کیا ہے

اک وقفہ ہے قیسؔ جسے ہم موت سمجھ لیتے ہیں
زیست کا نام بدل دیتے ہیں مرنا ورنا کیا ہے

اک حرف ملامت نے جگر کاٹ دیا ہے
سوچا ہے تو پھر دست ہنر کاٹ دیا ہے

ایندھن کی ضرورت میرے بچوں کو بہت تھی
میں نے وہ صنوبر کا شجر کاٹ دیا ہے

منزل کی طلب میں کبھی منزل نہیں دیکھی
امید سفر میں یہ سفر کاٹ دیا ہے

چیلیں بھی ڈراتی ہیں مجھے شور مچا کر
کس نے مرے شہباز کا پر کاٹ دیا ہے

ہم سے تو جدائی کی گھڑی بھی نہیں کٹتی
لوگوں نے تو پتھر کا جگر کاٹ دیا ہے

جو میری حمایت کے لیے قیسؔ اٹھا تھا
خود میرے ہی ہاتھوں نے وہ سر کاٹ دیا ہے

بیٹھ کر ساحل پہ دریا دیکھنا
بھیڑ میں لوگوں کو تنہا دیکھنا

شام سے پہلے جلا لینا چراغ
پھر مزے سے رخ ہوا کا دیکھنا

بھول جانا روز اپنے آپ کو
روز اپنے گھر کا رستا دیکھنا

اک تلاش بے ثمر کہہ لیجیے
اتنے چہروں میں وہ چہرہ دیکھنا

روز جانا اس گلی میں بار بار
ایک ہی منظر ہمیشہ دیکھنا

میں انا کو دار تک لے جاؤں گا
آج تم میرا تماشا دیکھنا

اپنی آنکھوں کی یہی توصیف ہے
آپ کو حد سے زیادہ دیکھنا

یہ بری عادت بھی ہم نے سیکھ لی
ادھ کھلی آنکھوں سے سپنا دیکھنا

سب زمیں کا چاند کہتے ہیں تمہیں
میری قسمت کا ستارہ دیکھنا

ہم جلاتے ہیں دیا اور قیسؔ تم
آگ کب لگتی ہے اتنا دیکھنا

جل رہے ہیں جسم و جاں اللہ میاں
دے مجھے آب رواں اللہ میاں

اک مسلسل آتش غم کا عذاب
میری گیلی لکڑیاں اللہ میاں

پھر کوئی داغ گلاب آرزو
اڑ گئی ہیں تتلیاں، اللہ میاں

چین سے جینے نہیں دیتے مجھے
یہ مرے سود و زیاں اللہ میاں

پھر تعاقب میں ہے اک آوارگی
بھاگ کر جاؤں کہاں، اللہ میاں

میری آنکھوں میں چمکتی ہیں ابھی
وہ کھنکتی چوڑیاں اللہ میاں

تہمت خود اختیاری اور پھر
اس قدر مجبوریاں اللہ میاں

مار ڈالے گا اسے قد کا ملال
دے اسے بیسا کھیاں اللہ میاں

یہ جبیں وہ آستان یار قیس
یہ سفر یہ دوریاں اللہ میاں

رہنے والے کتنے ہیں یا رستے کتنے ہیں
کون بتائے زخم جگر کے سارے کتنے ہیں

ان بستی والوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں
گھر میں زندہ رہنے والے مرتے کتنے ہیں

اپنے دل کی ایک گلی ہے اور وہ بھی تاریک
اس کے گھر کو جانے والے رستے کتنے ہیں

میں بھی بنجر دھرتی ہوں پر پیاسا رہتا ہوں
وہ بھی پتھر ہے پر اس میں جھرنے کتنے ہیں

کیسے کیسے دکھ ہیں دل کے کونوں میں آباد
میرے اس چھوٹے سے گھر میں کمرے کتنے ہیں

مجھ کو دوست برا کہتے ہیں تو یوں لگتا ہے
یہ میرے لاوارث بچے اچھے کتنے ہیں

کچھ چیزوں کی قیمت دھوپ گھٹا دیتی ہے قیسؔ
اس میلے میں موم کے پتلے سستے کتنے ہیں

آنکھ کچھ ڈھونڈتی تو رہتی ہے
منظروں کی کمی تو رہتی ہے

لاکھ آسانیاں ہوں رستے میں
ایک مشکل پڑی تو رہتی ہے

زخم سے پیٹ تو نہیں بھرتا
پر طبیعت لگی تو رہتی ہے

تجھ سے ملنے کی آس کیا توڑیں
یہی ٹہنی ہری تو رہتی ہے

حادثہ تو کبھی نہیں...... مرتا
ذہن میں وہ گلی تو رہتی ہے

آرزو ڈوبنے نہیں دیتی
ریت میں تیرتی تو رہتی ہے

یہ مرا دل چراغ ہے میرا
اس سے کچھ روشنی تو رہتی ہے

جب شجر رات کو نہیں سوتے
یہ زمیں جاگتی تو رہتی ہے

ہم پسِ ابر دیکھتے ہی نہیں
چاند میں اک پری تو رہتی ہے

اپنے اندر بھی لوگ مرتے ہیں
زندگی نام کی تو رہتی ہے

کس گھڑی ہم کہاں نہیں ہوتے
اس قدر آگہی تو رہتی ہے

کوئی ثابت نہیں ہے قیسؔ یہاں
زندگی ٹوٹتی تو رہتی ہے

اب آنکھ والوں سے بہتر دکھائی دیتا ہے
یہ آسمان زمیں پر دکھائی دیتا ہے

یہ بات ظرفِ نظر کی ہے، ہم کو کیا معلوم
کہ کس کو کون سا منظر دکھائی دیتا ہے

لباس ہم نے پہن کر بدن تو ڈھانپ لیا
مگر وہ زخم جو اندر دکھائی دیتا ہے

میں اپنی آنکھیں کسی پر نثار کیسے کروں
وطن سے دور مجھے گھر دکھائی دیتا ہے

صدائیں آتی ہیں رونے کی آئینے سے مجھے
پھر ایک چہرہ سا اکثر دکھائی دیتا ہے

میں اپنی ریت میں ہر روز تیر لیتا ہوں
یہ دشت مجھ کو سمندر دکھائی دیتا ہے

ضرور کوئی پرندہ ہے قیسؔ جو مجھ کو
بلندیوں سے فقط پر دکھائی دیتا ہے

تو کیا ہوا، وہ سفر کے لیے روانہ ہوا
اداس رہنے کا یہ بھی کوئی بہانہ ہوا

تمہاری ایک امانت سنبھال رکھی ہے
اگرچہ قصۂ دل تو بہت پرانا ہوا

ہمیں کو دیکھتے رہنا ہمیں سے چھپ جانا
کبھی چراغ جلانا، کبھی بجھانا ہوا

جو پر ملے تو ہر اِک سمت اڑ گئے پنچھی
ہمارا گھر نہ ہوا کوئی آشیانہ ہوا

وہ تیر ایک تھا پر زاویئے کئی تھے قیسؔ
کوئی بچا ہی نہیں سب کا دل نشانہ ہوا

تری جدائی کا صدمہ کسی سبب سے ہے
یہ کرب ذات نیا تو نہیں ہے جب سے ہے

ہمیں نہیں ہیں جو تیرہ شبی میں زندہ ہیں
یہ ربط خاص تری زلف کا تو سب سے ہے

اسی کے دم سے ہیں ساری محبتیں باقی
وہ ایک حرف جو منسوب تیرے لب سے ہے

خیال یہ تھا وہ ساون میں لوٹ آئے گا
یہ انتظار ہمیں بارشوں کا تب سے ہے

ترے لیے بھی کبھی کھل کے ہم نہیں روئے
یہ جبر عشق ترے نام کے ادب سے ہے

مفر چراغ سے کیونکر ہو شب نشینوں کو
گلہ تو ان کو فقط روشنی کے ڈھب سے ہے

بس ایک شور سا ہے قیسؔ آرزوئے وصال
تمام لذت ہجراں سکوت شب سے ہے

قربتوں میں حدیں بھی رکھتے ہیں
ہم بری عادتیں بھی رکھتے ہیں

یہ جو آنکھوں کی کھڑکیاں سی ہیں
ان کو دیوار میں بھی رکھتے ہیں

ہم کو خوشبو دکھائی دیتی ہے
ہم نظر میں تمہیں بھی رکھتے ہیں

دل بھی رکھتے ہیں بے طلب لیکن
ہم کئی خواہشیں بھی رکھتے ہیں

ان درختوں کے سائے ہیں ہم پر
جو زمیں میں جڑیں بھی رکھتے ہیں

قیسؔ روشن ضمیر بھی ہیں ہم
انگلیوں میں لویں بھی رکھتے ہیں

ان کو طرزِ وفا نہیں آتی
بات کرنی بھی کیا نہیں آتی

جو دریچہ کھلا نہیں رکھتے
ان کے گھر میں ہوا نہیں آتی

اس قدر شور ہے مرے اندر
مجھ کو اپنی صدا نہیں آتی

کچھ دنوں سے عجیب راحت ہے
گھر میں کوئی بلا نہیں آتی

زندگی چپ سی ہوگئی ہے قیسؔ
کوئی آواز پا نہیں آتی

رنگ کو رنگ سحر کیا لکھتے
بے ہنر حرف ہنر کیا لکھتے

وہ جو لکھنے میں تھے بیباک بہت
وہ بھی دیوار کو در کیا لکھتے

اتنی فرصت ہی کہاں تھی ہم کو
رتجگوں کا یہ سفر کیا لکھتے

ہم ترے ہجر میں زندہ کب تھے
اپنے ہونے کی خبر کیا لکھتے

ہم کو لکھنا تھا بہت لکھنا تھا
تیرے بارے میں مگر کیا لکھتے

اپنی آنکھوں سے پرے دیکھتے ہیں
ہم محبت کا اثر کیا لکھتے

قیسؔ پردیس کو گھر کیا کہتے
دشت کو چاند نگر کیا لکھتے

سلسلے وقت، شام کیا کیا تھے
فرصتیں تھیں تو کام کیا کیا تھے

تھیں کئی اک جنوں کی تفسیریں
اک محبت کے نام کیا کیا تھے

اس کی آنکھوں میں پیاس چمکی تھی
روشنی کے مقام کیا کیا تھے

وقت کتنا شریر تھا پہلے
ان دریچوں میں دام کیا کیا تھے

تھیں وہ آنکھیں مرے تعاقب میں
رقص میں میرے جام کیا کیا تھے

نت نئے اہتمام سے ملنا
وہ بہم انتظام کیا کیا تھے

لوگ جلتے تھے دیکھ کر ہم کو
سازشوں کو دوام کیا کیا تھے

زعم کتنا تھا قیسؔ دل پہ ہمیں
ہم بہرحال خام کیا کیا تھے

❁

نئی لویں نئی تابندگی کہاں کی ہے
مرے چراغ میں یہ روشنی کہاں کی ہے

یہ چاند چہرے زمیں پر اتارنے والے
مزاجِ عشق میں کوزہ گری کہاں کی ہے

شجر شجر لیے پھرتا ہے آب و گل کا جمال
مرے لہو میں یہ آوارگی کہاں کی ہے

نفس نفس میں تری ذات کے حصار میں ہوں
یہ اختیار ہے تو بے کلی کہاں کی ہے

ہمیں خبر ہے کسی کا کوئی نہیں ہوتا
یہ آرزو سی مگر سر پھری کہاں کی ہے

یہ کون حرف کی عظمت بحال رکھتا ہے
ہمارے لہجے میں آہستگی کہاں کی ہے

کسی کو کوئی دریچے سے جھانکتا بھی نہیں
یہ بے کسی درو دیوار کی کہاں کی ہے

زبان شعر کو چپ سی لگی ہوئی ہے قیسؔ
سکوت جبر میں ہوں شاعری کہاں کی ہے

یعنی کمال کسب ہنر میں گزار دی
اک عمر ہم نے راہگذر میں گزار دی

آنگن کی دھوپ نے اسے اتنا ڈرا دیا
سائے نے ساری رات شجر میں گزار دی

اس شہر بے اماں میں اماں ڈھونڈتے کہاں
تھوڑی سی زندگی تھی سو گھر میں گزار دی

شوق وصال شاخ بدن سے لپٹ گیا
ہم نے وہ رات اپنے ہی اندر گزار دی

رزق ہوا کے شوق نے چلنا سکھا دیا
پھر ہم نے ایک عمر سفر میں گزار دی

کل وہ بھی کُنج بام کی زینت بنا رہا
ہم نے بھی شام روزن در میں گزار دی

کچھ کٹ گئی تھی قیسؔ دعا مانگتے ہوئے
کچھ ہم نے انتظار اثر میں گزار دی

ہجر یوں تو معتبر میرا بھی ہے
جبر کے نیزے پہ سر میرا بھی ہے

میں بھی تو چلتا ہوں اپنی آگ پر
راستہ تو پر خطر میرا بھی ہے

سائباں در سائباں ہے آرزو
بے در و دیوار گھر میرا بھی ہے

اپنی جانب دوڑتا رہتا ہوں میں
رائیگاں سارا سفر میرا بھی ہے

ایک دن دریا بہالے جائے گا
اک گھروندہ ریت پر میرا بھی ہے

میں جہاں بھی ہوں کسی کے ساتھ ہوں
یعنی کوئی ہم سفر میرا بھی ہے

حسن اس کا ہی سہی شعروں میں قیسؔ
حرف کی تہہ میں ہنر میرا بھی ہے

دہان زخم چھپا کر کہاں سے آئے ہیں
ہم اوڑھ کر نئی چادر کہاں سے آئے ہیں

خیال و خواب ہوئے کاروان خواب و خیال
یہ قافلے مرے اندر کہاں سے آئے ہیں

ہوا میں کس کے بدن کی مہک چمکتی ہے
یہ میرے راستے ہو کر کہاں سے آئے ہیں

یہ کون ہیں کہ کوئی منتظر نہیں جن کا
یہ لوگ لوٹ کے اب گھر کہاں سے آئے ہیں

یہ روشنی مرے اطراف میں کہاں کی ہے
فلک کے چاند زمیں پر کہاں سے آئے ہیں

بجا کہ روزن جاں میں کوئی نہیں آباد
تو پر یہ ٹوٹے ہوئے پر کہاں سے آئے ہیں

میں اپنے آب رواں کی تلاش میں ہوں قیسؔ
یہ ریت ریت سمندر کہاں سے آئے ہیں

آپ کا نام کیا لیا کتنے چراغ جل گئے
اپنی تو رات کٹ گئی اپنے تو دن بدل گئے

ایک ذرا سا واقعہ دل میں چھپا کے رکھ لیا
اتنی سی احتیاط سے کتنے عذاب ٹل گئے

شام فراق تھی رواں، چاند بھی تھا دھواں دھواں
لمحے ترے وصال کے ہاتھ سے یوں نکل گئے

میں کہ سراب وہم تھا اپنے کمال وہم کا
ڈھل گیا آفتاب تو سائے مجھے نگل گئے

آنکھ سے یوں ڈھلک گیا آنسو ملال ہجر کا
مجھ کو بھی آگ لگ گئی اس کے بھی ہاتھ جل گئے

موسم جاں خراب تھا چلنا بڑا عذاب تھا
ہم بھی عجیب لوگ تھے حد سے پرے نکل گئے

یہ مری خوش خیالیاں، یہ میری سبز ڈالیاں
آنکھ میں جتنے پھول تھے رنگِ حنا میں ڈھل گئے

دیکھا تو قیسؔ جیب میں سکے کھرے نہ تھے مگر
اہلِ ہنر کے فیض سے شہرِ ہنر میں چل گئے

سفر نصیب ہو تو حوصلہ بھی ساتھ رہے
چراغ جلتے رہیں اور ہوا بھی ساتھ رہے

دیار شب سے گزر جاؤ جگنوؤں کی طرح
جمال یار کا روشن دیا بھی ساتھ رہے

مرے لیے تو مری خامیاں ہی کافی تھیں
یہ آرزو کہ ترا سانحہ بھی ساتھ رہے

میں اپنے آپ کو خود سے چھپا کے کیا کرتا
کہ ہر قدم پہ مرا آئینہ بھی ساتھ رہے

عجیب ہی سہی سائے کی آرزو لیکن
کوئی بھرم کسی دیوار کا بھی ساتھ رہے

یہ کیسا اذن مشیت ہے قیسؔ میرے لیے
میں جنگلوں میں رہوں اور بلا بھی ساتھ رہے

غزل کہنی ہے پر جی چاہتا نئیں
یہ مشکل کام میرے کام کا نئیں

جگر کے زخم سے کچھ روشنی تھی
چلو اچھا ہوا، یہ بھی رہا نئیں

جسے شعروں میں ہم دہرا رہے تھے
وہ دل کا تھا ہمارا واقعہ نئیں

شرابوں میں شرابیں کیا ملائیں
محبت میں محبت کا مزا نئیں

ہمیشہ کی جدائی کیا بری ہے
اسے ملنے میں بھی تو فائدہ نئیں

یہ آنکھیں نیند سے محروم ہیں تو
ہمیں کیا! یہ ہمارا مسئلہ نئیں

غلط فہمی تو اس کو بھی بہت ہے
کہ اس کے بعد کوئی چاند سا نہیں

یہ ہم جو آج تک زندہ ہیں شاید
ابھی مرنے کا ہم کو تجربہ نہیں

بڑے آرام سے رہتے ہیں گھر میں
یہاں اب کوئی ہم کو جانتا نہیں

یہ آنکھیں تو بہت کچھ دیکھتی ہیں
مگر ہم نے کسی سے کچھ کہا نہیں

یہ عالم کونسا عالم ہے یارب
جہاں طوفان ہے لیکن ہوا نہیں

میں سارے شہر سے چھوٹا ہوں لیکن
وہ بونا اپنے گھر میں بھی بڑا نہیں

حویلی کا دریچہ چپ ہے جب سے
مرا سر میرے اندر بولتا نئیں

مرے ہمسائے کی خوش فہمیاں تھیں
وہ کتا اب کسی کو کاٹتا نئیں

میں ماں کی گود میں ہوں قیس اب تک
مرا بچپن مجھے بھولا ہوا نئیں

✿

ہجرتوں کا مسئلہ رہ جائے گا
زخم سینے پر دھرا رہ جائے گا

اپنی اپنی زندگی جی لیں گے ہم
اپنا اپنا واقعہ رہ جائے گا

کل کہاں ہوگا کوئی کس کو خبر
یہ دریچہ تو کھلا رہ جائے گا

جب وہ کھو جائیگا اپنی بھیڑ میں
بستیوں میں اور کیا رہ جائے گا

وہ گلی بھی بھول جائے گی ہمیں
دل میں بس اک راستہ رہ جائے گا

شہر ترسے گا تری آواز کو
اور اک شور ہوا رہ جائے گا

اپنی اپنی بات کہہ جائینگے لوگ
اور لوگوں کا کہا رہ جائے گا

ہم بھی اس کو دیکھتے رہ جائینگے
وہ بھی ہم کو سوچتا رہ جائے گا

قیسؔ وہ چھولیں گے جس کو ایک بار
بس وہی پتا ہرا رہ جائے گا

کسی گلی سے ہوا بھی کوئی نہیں آئی
میں انتظار میں ہوں وہ گھڑی نہیں آئی

تمام رات وہ آنکھوں کے سامنے ہی رہا
تمام رات مجھے نیند ہی نہیں آئی

مرا نصیب ہی مجھ کو خراب کرتا ہے
ترے خلوص میں کوئی کمی نہیں آئی

تمہارے ساتھ ہی آتی تھی جب بھی آتی تھی
وہ رات پھر میرے گھر میں کبھی نہیں آئی

بچھڑ گیا تھا تو ہم بے حساب روئے تھے
ہمارے بعد اسے بھی ہنسی نہیں آئی

کسی دریچے سے اب کوئی جھانکتا ہی نہیں
ہماری سمت کوئی روشنی نہیں آئی

پلٹ پلٹ کے وہ دریا بلا رہا تھا قیسؔ
میں کیا کروں مجھے آواز ہی نہیں آئی

آنکھ میں ساگر ہو تو جھرنا یاد نہیں رہتا
قطرہ قطرہ کوئی دریا یاد نہیں رہتا

دھوپ نگل جاتی ہے سارے حرف جدائی کے
رفتہ رفتہ دل کا قصہ یاد نہیں رہتا

دیواروں پر دستک دینے آجاتی ہے شام
اور دیے کو زخم ہوا کا یاد نہیں رہتا

سوچ رہے ہیں آئینے کو اب کیا روئیں ہم
اب تو ہم کو اپنا چہرا یاد نہیں رہتا

موم کے پتلے ہاتھ میں لے کر پھرتے رہتے ہیں
کچھ لوگوں کو دھوپ کا میلہ یاد نہیں رہتا

کوئی میری بانہہ پکڑ کر بستی تک لے جائے
مجھ کو اپنے گھر کا رستا یاد نہیں رہتا

جاگتا رہتا ہوں تو خواب ستاتے رہتے ہیں
سوجاؤں تو کوئی سپنا یاد نہیں رہتا

ہم بھی شاعر بن ہی جاتے قیسؔ مگر ہم کو
قلم، دوات، سیاہی بستہ یاد نہیں رہتا

بیٹھا ہوا ہے راکھ میں چھپ کر شرر کہاں
اب اپنے پاس دیکھنے والی نظر کہاں

دل اس قدر فریفتہ اس کی ادا کا تھا
ایسی ہمارے حال کی ہم کو خبر کہاں

اس شہر سنگ میں بھی پتھر فروش ہیں
تعمیر کر رہے ہو تم شیشے کا گھر کہاں

چلمن کی اوٹ اوٹ سے وہ روشنی کا شور
وہ بولتے ہوئے ترے دیوار و در کہاں

ہوتی تھی جس کی زلف سے ہر شب کی ابتدا
اس کے بدن سے پھوٹنے والی سحر کہاں

اب کیا دھرا ہوا ہے نشیمن کی راکھ میں
اب ڈھونڈنے چلے ہو پرندوں کے پر کہاں

رکتے ہیں پائے شوق کہن کس مقام پر
ہوتا ہے ختم دیکھیے جا کر سفر کہاں

آنکھوں نے بار بار بڑے حوصلے دیئے
شاید وہ مل ہی جائے کسی دن مگر کہاں

آواز آ رہی ہے ہمیں منزلوں سے قیسؔ
پر اپنے پاس دولت رخت سفر کہاں

قطعات

خفت کا کوئی کام بتایا نہیں مجھ کو
لڑنا کسی بچے سے سکھایا نہیں مجھ کو
قصے ہی سناتی رہی پریوں کے ہمیشہ
ماں نے کبھی جنوں سے ڈرایا نہیں مجھ کو

☆......☆......☆

سانحہ یوں بھی تو گزرتا ہے
آبلے دل میں پھوٹ جاتے ہیں
لوگ برتن جو کانچ کا ٹھہرے
احتیاطاً بھی ٹوٹ جاتے ہیں

☆......☆......☆

رشتۂ صوت و صدا ٹوٹ گیا
مجھ میں کیا جانیے کیا ٹوٹ گیا
میں کھلونا ہی تو تھا مٹی کا
اس کے ہاتھوں سے گرا ٹوٹ گیا

ساری دنیا کو بے خبر رکھا
لمحہ لمحہ خبر اُسے دے دی
وقت تقسیم کر لیا ہم نے
شام رکھ لی سحر اُسے دے دی

☆......☆......☆

اک نئے تجربے سے گزرے ہیں
لطف سا آرہا ہے جینے میں
جب سے ہم نے چراغ مانگا ہے
داغ سا پڑگیا ہے سینے میں

☆......☆......☆

یہ گل اب گلستاں ہونے لگے ہیں
زمیں سے آسماں ہونے لگے ہیں
بڑھاپا یوں ہمیں اچھا لگا ہے
کہ بچے اب جواں ہونے لگے ہیں

آخرکار یہ شباب گیا
ایک تکلیف اک عذاب گیا
ذہن سے لذت وصال گئی
ہاتھ سے عرصۂ ثواب گیا

☆......☆......☆

صحن چمن سے جب بھی گزر کر گئے ہیں وہ
دل کی کہانیاں ہر پتوں پہ لکھ گئے
بچے مری گلی کے بہت ہی شریر ہیں
پھر آج تیرا نام درختوں پہ لکھ گئے

☆......☆......☆

میں رات بھر نہیں سویا تو میری آنکھوں نے
خیال و خواب کی عظمت بحال رکھی ہے
نفس نفس میں وہی آنچ ہے وہی خوشبو
ترے وصال کی لذت سنبھال رکھی ہے

کسی قربت کا اہتمام کرو
یا کوئی شب گزار کر دیکھو
روشنی ہے وصال کا لمحہ
آنکھ سے جب گزار کر دیکھو

☆......☆......☆

یہ مرحلے بھی مجھے سوز عشق کے دے دے
مرے خدا مری آنکھوں کو رتجگے دے دے
میں کیا کروں مرے اندر سفر سا جاری ہے
جو مجھ کو مجھ سے ملا دیں وہ راستے دے دے

☆......☆......☆

قربت بھی نہیں ہجر کا لمحہ بھی نہیں ہے
احساس کا چڑھتا ہوا دریا بھی نہیں ہے
بچھڑے ہوئے منظر ہیں تو اجڑی ہوئی آنکھیں
جو اس نے دکھائی تھی وہ دنیا بھی نہیں ہے

یہی حسرت کہ بام و در دیکھوں
اسی منظر کو موڑ پر دیکھوں
چار دیواریاں ہیں اینٹوں کی
گھر سے نکلوں تو اپنا گھر دیکھوں

☆......☆......☆

یہ تو ہوا کہ دھیان تو اس کا بڑا رہا
موتی سا اس کی یاد کا دل میں جڑا رہا
اے دوست! ہجر یار میں لذت کہاں کی تھی
کانٹوں پہ رات بھر کوئی کیسے کھڑا رہا

☆......☆......☆

اس دل کی دعاؤں کے اثر کو نہیں دیکھا
جب پیڑ لگائے تو ثمر کو نہیں دیکھا
وہ دن کہ تری آنکھ سے دیکھی ہے یہ دنیا
اس دن سے کبھی چاک جگر کو نہیں دیکھا

حیات یوں تو محبت میں کیا سے کیا نہ ہوئی
یہ اور بات کہ تم سے کبھی وفا نہ ہوئی
میں ہجرتوں میں رہا اور تمہارے ساتھ رہا
کبھی زمین مرے پاؤں سے جدا نہ ہوئی

☆......☆......☆

رسم تجدید وفا کے شوق میں
آج اپنے دل کا کہنا مان کر
اس سے ملنے جب میں اس کے گھر گیا
وہ بہت رویا مجھے پہچان کر

☆......☆......☆

آنگن کی دھوپ پیڑ کے سائے نگل گئی
واپس گھروں کو لوٹ رہی ہیں یہ چیونٹیاں
دیوار و در پہ رات اترنے لگی ہے قیسؔ
اب ہم چراغ ڈھونڈنے جائیں کہاں کہاں

یا الٰہی یہ چاہتیں کیا ہیں
آس دل میں کہاں سے آتی ہے
یہ سمندر، یہ بارشیں، معلوم
پیاس دل میں کہاں سے آتی ہے

☆......☆......☆

مرے سب شعر اس کے نام کر دو
جو میرے حرف کو پہچانتا ہے
مجھے پڑھنے سے بھی قاصر ہے لیکن
مرے لفظوں کے نقطے جانتا ہے

☆......☆......☆

اس نے حیران کر دیا مجھ کو
سب غبارے ہوا میں چھوڑ دیے
ایک مٹی کا دل نہیں توڑا
کانچ کے سب گلاس توڑ دیے

کئی دنوں سے ترے اعتبار میں گم ہوں
یہ انتشار مری ذات کے فشار کا ہے
سواد شام سے پہلے نظر نہیں آتا
اک آبلہ مری آنکھوں میں انتظار کا ہے

☆......☆......☆

نیند میں سب دکھائی دیتا ہے
جاگتا ہوں تو دیکھتا بھی نہیں
مسئلہ اک تری وفا کا ہے
سوچتا ہوں تو مسئلہ بھی نہیں

☆......☆......☆

نوچ کر چڑیوں کے پر بھی لے گئے
سبز شاخوں سے ثمر بھی لے گئے
اب کے اتنے مہربان تھے ہم سفر
چادروں کے ساتھ سر بھی لے گئے

محبتوں کا ذرا سا خیال بھی کرنا
بچھڑ گئے ہو تو کوئی ملال بھی کرنا
گزار دو مجھے آنکھوں سے روشنی کی طرح
جلا دیا ہے تو اب یہ کمال بھی کرنا

☆......☆......☆

دامن کیا چھوٹا ہے ساتھ بھی چھوڑ دیے ہیں
دل کو جانے والے رستے موڑ دیے ہیں
یہ انہونی بات ہے لیکن سچ ہے یارو
شیشے کے لوگوں نے پتھر توڑ دیے ہیں

☆......☆......☆

آہٹوں کے اثر میں رہتا ہے
سارا مَنظر سفر میں رہتا ہے
ایسے لگتا ہے جیسے میرے سوا
اور بھی کوئی گھر میں رہتا ہے

مجھ کو اپنے حافظے پر شک نہیں
سب شگوفے ساری کلیاں یاد ہیں
وہ دریچے چاند رہتے تھے جہاں
آج بھی مجھ کو وہ گلیاں یاد ہیں

☆......☆......☆

آنکھ حسن یار پر رکھی گئی
آرزو تلوار پر رکھی گئی
داغ تھا سینے کے اندر رکھ دیا
روشنی دیوار پر رکھی گئی

☆......☆......☆

سوچتا ہوں تو خوف آتا ہے
زندگی کتنے موڑ مڑتی ہے
ایک جھونکا ہوا کا آیا تھا
آج تک گھر میں خاک اڑتی ہے

میں اپنی ذات کی تنہائیوں کے جبر میں ہوں
وہ حیرتیں ہیں کہ احساس زندگی بھی نہیں
مجھے خبر ہے مرے پاؤں کیوں نہیں لگتے
میں جس زمیں پہ کھڑا ہوں مری زمیں ہی نہیں

☆......☆......☆

مدتوں سے ملال ہجراں کا
صورت ضعف دل پہ طاری ہے
غیر منقوط حرف ہوں جیسے
ایک نقطہ بھی مجھ پہ بھاری ہے

☆......☆......☆

آرزو نے حصار کیا کرتے
آنکھ کو زیر بار کیا کرتے
ہم کو نیند آ گئی تھی رستے میں
رات کا انتظار کیا کرتے

مرحلے کچھ خفی بھی ہیں مجھ سے
راستہ آشکار بھی ہے مرا
دھوپ سے دُشمنی بھی ہے میری
موم کا کاروبار بھی ہے مرا

☆......☆......☆

درو دیوار سے ڈر جاتا ہوں
اک قیامت سے گزر جاتا ہوں
رات سونے نہیں دیتی مجھ کو
دن نکلتا ہے تو مر جاتا ہوں

☆......☆......☆

دفعتاً پھر تمہاری یاد آئی
آبلہ سا جگر میں پھوٹ گیا
چاند تھا میرے دونوں ہاتھوں میں
اور مرا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا

مجھ کو سولی پہ چڑھا دیتا ہے
سارا نشہ ہی اڑا دیتا ہے
جب بھی میں دیر سے گھر آتا ہوں
راستہ شور مچا دیتا ہے

☆......☆......☆

مرے دل کے کسی کونے میں چھپ کر
گئے وقتوں کے صدمے جھیلتا ہے
پس جاں ایک چھوٹی سی گلی میں
مرا بچپن ابھی تک کھیلتا ہے

☆......☆......☆

محبت بے اثر کوئی نہیں ہے
ہمیں اپنی خبر کوئی نہیں ہے
ہم ان کے دل میں رہتے ہیں ہمیشہ
ہمارا اپنا گھر کوئی نہیں ہے

مزاج شب سے میں برہم نہیں ہوں
یہ عالم اب میرا عالم نہیں ہے
کہیں سے چاند اتر آیا ہے مجھ میں
محبت روشنی سے کم نہیں ہے

☆......☆......☆

ہے تہ در تہ کئی پردوں میں دنیا
چمکتی ہے مری آنکھوں میں دنیا
میں بیساکھی کے میلے میں کھڑا ہوں
کھلونا ہے مرے ہاتھوں میں دنیا

☆......☆......☆

خالی برتن کی طرح ہے زندگی
پیاس بڑھتی ہے تو بھر جاتا ہوں میں
جب کوئی ندی بلاتی ہے مجھے
اپنے اندر سے نکل آتا ہوں میں

اس گلی سے گزرنے والوں کو
موسموں کے سراغ ملتے تھے
خوشبوئیں بام و در میں رہتی تھیں
کھڑکیوں میں گلاب کھلتے تھے

☆......☆......☆

میں اپنی راکھ کے سر پر کھڑا ہوں
مرے اندر بلا کے حوصلے ہیں
مرا ہر دوست مجھ کو تاج سر ہے
مرے دشمن مرے پیروں تلے ہیں

☆......☆......☆

عرصۂ شور سفر ہے ہر سو
رنگ کے پار اتر جانا ہے
ہم تو چڑیوں کی طرح ہیں، ہم کو
شام کو لوٹ کے گھر جانا ہے

جو بھی ملتا ہے سرراہ مجھے
کچھ نہ کچھ درس وفا دیتا ہے
جب دغا کرتا ہے اپنا کوئی
سوچتا ہوں مرا کیا لیتا ہے

☆......☆......☆

ایک لذت صدا کی ایسی تھی
جو مرے راستے ہی موڑ گئی
دفعتاً اس نے مجھ کو روک لیا
تو زمیں میرے پاؤں چھوڑ گئی

☆......☆......☆

سفر شوق اختیار کرے
مجھ کو آنکھوں کے آر پار کرے
میں دیا ہوں تو جل ہی جاؤں گا
روشنی میرا انتظار کرے

درون جاں کا نقشہ دیکھنا ہے
کوئی منظر کھنڈر کا دیکھنا ہے
کہیں دیوار شیشے کی ملے تو
مجھے بھی اپنا چہرا دیکھنا ہے

☆......☆......☆

میں کہ نا چیز سا بندہ ہوں ترا
مجھ کو یاروں کے موافق کر دے
اب یہاں سچ سی کوئی چیز نہیں
اے خدا! مجھ کو منافق کر دے

☆......☆......☆

یہ تو ہوا کہ رسم وفا تو نبھا گئے
اپنی محبتوں کا یقیں تو دلا گئے
ان کو ہمارے حال کا کتنا خیال تھا
دل بجھ گیا تو لوگ دیے لے کے آ گئے

آؤ الجھن کو سلجھائیں دونوں
اک دوجے میں آگ لگائیں دونوں
جینے کی خواہش میں اتنا بھاگیں
بھاگتے بھاگتے ہم مر جائیں دونوں

☆......☆......☆

اس کے لہجے میں جو اشارہ ہے
اک محبت کا استعارہ ہے
میرا دریا ہے اس کے سینے میں
جس کا وہ تیسرا کنارہ ہے

متفرق اشعار

میں نے بھی اس کو چوم لیا احترام سے
اس کو بھی میری ذات سے کوئی گلہ نہیں

✿

ہماری بستی میں کب بارشیں نہیں ہوتیں
زمیں ہار گئی دھوپ کی تمازت سے

✿

یہ سوچتے ہی کہ وہ شہر چھوڑ جائے گا
ہمارے پاؤں کے نیچے زمیں کھسکنے لگی

✿

یہ کیسی عادت ہے زندہ رہنے کی
روز اک نیزے پر میرا سر ہوتا ہے

آئینہ تو تھا ہمارے ہاتھ میں
پتھروں کو یہ خبر کیسے ہوئی

کچھ منظرِ حیات ہی اتنا کریہہ تھا
رونے پہ میری آنکھ بھی مجبور ہوگئی

میں نہ کہتا تھا وہ اپنی بھیڑ سے
جب بھی آئے گا اکیلا آئے گا

اپنی آنکھیں بھری ہوئی ہیں قیسؔ
ہم نے سارا جہان دیکھا ہے

تمام رات وہ آنکھوں کے سامنے ہی رہا
تمام رات مجھے نیند ہی نہیں آئی

مجھ کو پانی میں اترنے کی سزا دیتا ہے
وہ سمجھتا ہے کہ دریا نہیں دیکھا میں نے

بستی میں دور دور تک پتھر فروش ہیں
تعمیر کیا کرے کوئی شیشے کا گھر یہاں

وطن میں لوٹ کر آئے تو دیکھا
سفر کی دھول آنکھوں میں پڑی تھی

ایک جیسے اجاڑ ہیں دونوں
دل کو دیکھیں کہ اپنا گھر دیکھیں

آنکھوں کے آس پاس بڑی روشنی رہی
وہ شخص بار بار مجھے دیکھتا رہا

ہم نے کھنڈر یونہی نہیں دل کو بنا لیا
اس توڑ پھوڑ میں بڑا اہتمام تھا

دیارِ شب سے گزر جاؤ جگنوؤں کی طرح
جمالِ یار کا روشن دیا بھی ساتھ رہے

رزق ہوا کے جبر نے چلنا سکھا دیا
پھر ہم نے ایک عمر سفر میں گزار دی

مجھے کچھ واہمہ سا ہوگیا ہے
وہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے گھر میں

بازار عمر میں کہیں تعبیر کھو گئی
بچپن میں ایک خواب سا دیکھا تو ہم نے تھا

ہم اسی امید پر جیتے رہے
دل اجڑ جائے تو گھر آباد ہو

پڑ جائے تو رونے کی یہ عادت بھی بہت ہے
زندہ ہیں کہ مرنے کا بہانا نہیں ملتا

سوچتا ہوں روشنی کو کیا ہوا
یہ دیا میرا یہ گھر میرا تو ہے

کتنا آوارہ ہو گیا ہوں میں
راستہ سوچتا بھی کیا ہوگا

❁

اپنے پتھر کاٹتا رہتا ہوں میں
میرے اندر بھی تو اک فرہاد ہے

❁

اک دن مجھ کو ہاتھ پکڑ کر لے جاؤ
تم نے کہا تھا دل سے دل تک رستہ ہے

❁

دور جا کر دیکھتا ہوں تو مجھے
ایسا لگتا ہے کہ گھر آباد ہے

❁

یہ مرا دشمن مرا بھی ہو کبھی
دل کے ہاتھوں تنگ آجاتا ہوں میں

❁

داغ ہجراں کہاں چھپائیں ہم
اوڑھنے کے لیے بدن بھی نہیں

کوئی کرن مجھے ملنے ضرور آئے گی
مرا دریچہ مجھے بار بار گھورتا ہے

❁

ہم جو آنکھوں سے پرے رکھتے ہیں
کتنے ہی زخم ہرے رکھتے ہیں

❁

روح پیاسی ہے زمینوں کی طرح
اب گھٹا چھائے تو کھل کر برسے

❁

دیکھا جو ترا حسن تو کھولی نہیں آنکھیں
دنیا کی ہر اک شے ترے معیار سے کم تھی

❁

چین سے بیٹھنے نہیں دیتا
کوئی آسیب میرے گھر میں ہے

❁

ہمیں خبر تھی کہ ترتیب زندگی کیا ہے
ترے بغیر مگر انتظار کیا کرتے

عکس پڑتا ہے چاند کا

سعید قیس

فہرست

حمد

مناجات

نعت

غزلیات

……O……

حمد

اے خدائے عز و جل
شعر کا ہنر تیرا
حرف بے ضرر تیرا
بات کا اثر تیرا
خواہش ثمر تیری شوق بے ثمر تیرا
کرب کے حوالے سے آہ کا سفر تیرا
سارے بام و در تیرے
راہ کے شجر تیرے
یہ نگر یہ گھر تیرے
وصل کی تمنا میں شام ہجر بھی تیری
رنگ جبر بھی تیرا طرز فکر بھی تیری
سب نشان تیرے ہیں
سب مکان تیرے ہیں
آسمان تیرے ہیں
لب پہ جنبشیں تیری
دل میں حیرتیں تیری
یہ محبتیں تیری

زیست کے حوالے سے بے نشاں خوشی تیری
میرے گھر کے آنگن میں ساری روشنی تیری
جو بھی ہے وہ سب تیرا
زندگی کا ڈھب تیرا
شوق بے سبب تیرا
کیا خبر کہ تو کیا ہے
کیا پتا کہ میں کیا ہوں!

حمد

جو بھی ہے بام و در میں تیرا ہے
رنگ حسن نظر میں تیرا ہے

روشنی سب ترے جمال کی ہے
ہر کرشمہ شرر میں تیرا ہے

عزم پرواز میں رضا تیری
حوصلہ بال و پر میں تیرا ہے

یہ جو کسب کمال ہے یا رب
سب مرے شیشہ گر میں تیرا ہے

شوق حسن و جمال آئینہ
میرے دل میرے گھر میں تیرا ہے

یہ جو لذت ہے تیرے نام کی ہے
یہ جو سودا ہے سر میں تیرا ہے

یہ دلوں کے گداز تیرے ہیں
ذائقہ ہر ثمر میں تیرا ہے

ساری بستی تلاش میں ہے قیسؔ
سارا جھگڑا نگر میں تیرا ہے

مناجات

دل کہاں تک تری دہائی دے
میرے مولا! مجھے سنائی دے

میں بھی اک روز لہلہا اٹھوں
میری دیوار کو بھی کائی دے

ہو سکے تو کبھی ان آنکھوں سے
کسی حیرت کو بھی رہائی دے

حسن کو دولت کرم سے نواز
عشق کو درد آشنائی دے

حرف مجھ پر اتارنے والے
میرے حرفوں کو روشنائی دے

میری آنکھیں بھی خوبصورت ہیں
مجھ کو بھی ایک دن دکھائی دے

میں ترا قرض ہوں، اُتار مجھے
میرے حصے کی پائی پائی دے

ہر منافق سے میں جہاد کروں
طاقت زور آزمائی دے

قیس کو بھی پناہ خاص میں رکھ
اس کو بھی عزم کربلائی دے

❁

نعت

تابش گنبد خضرہ ہے مرے سینے میں
اک عجب نور کا دریا ہے مرے سینے میں

خواب غفلت میں کھلی رہتی ہیں آنکھیں میری
دل مرا جاگتا رہتا ہے مرے سینے میں

روشنی آپ کے اوصاف بیاں کرتی ہے
اک دیا شام کو جلتا ہے مرے سینے میں

درد کس زعم سے اٹھتا ہے مرے دل کے قریب
زخم کس شان سے پلتا ہے مرے سینے میں

روز چلتی ہیں عقیدت کی ہوائیں مجھ میں
ایک چھوٹا سا دریچہ ہے مرے سینے میں

سوچتا ہوں تو بہت دور ہے منزل میری
دیکھتا ہوں تو مدینہ ہے مرے سینے میں

اک کرن جھانکتی رہتی ہے دریچے سے مجھے
اک عجب رنگ تماشا ہے مرے سینے میں

قیسؔ یہ نور تصور ہے کہ چہرہ ان کا
روز اک چاند اترتا ہے مرے سینے میں

غزلیات

❁

شور کیسا ہے مبتلا مجھ میں
کون رہتا ہے دوسرا مجھ میں

میں کسی جبر کے حصار میں ہوں
اک سفر ہے رکا ہوا مجھ میں

جانے کیا تھا کہ رات اس کا خیال
راستہ ڈھونڈتا رہا مجھ میں

ٹمٹماتے رہے گلی کے چراغ
رقص کرتی رہی ہوا مجھ میں

کب سے اپنی تلاش ہے مجھ کو
تو نے کیا کیا چھپا دیا مجھ میں

کتنا سر سبز ہوگیا ہوں میں
کونسا زخم تھا ہرا مجھ میں

اس قدر غور سے نہ دیکھ مجھے
عکس پڑتا ہے چاند کا مجھ میں

قیسؔ وہ شخص عام سا تھا مگر
کتنے منظر سجا گیا مجھ میں

❁

خیال و خواب کی دنیا کہاں ہے
تری آنکھیں ترا چہرا کہاں ہے

ہم اپنے شوق میں ڈوبے ہوئے ہیں
ہمارے شہر میں دریا کہاں ہے

تو ساری جستجو ہی رائیگاں تھی!
وہ اک لمحہ رفاقت کا کہاں ہے

ہر اک تارے سے جا کر پوچھتا ہوں
یہ سورج رات کو جاتا کہاں ہے

یہ کیسا شور ہے دیوار و در کا
ہمارے گھر میں وہ رہتا کہاں ہے

ابھی رسوائیاں تو اور ہوں گی
ابھی ہم نے اسے سوچا کہاں ہے

اگر ہم ریت کی دیوار تھے تو
ہمارے جسم کا ملبہ کہاں ہے

طلب کے راستے پر آ گیا ہوں
بتاؤ اَب مجھے جانا کہاں ہے

محلے دار سب آرام سے ہیں
مرے ہمسائے کا کتا کہاں ہے

یہ ہم جو قیسؔ ہیں بس نام کے ہیں
ہمارے سر میں وہ سودا کہاں ہے

✿

ہجر کا قافیہ نکل آیا
میرے اندر گھڑا نکل آیا

دھوپ نکلی تو آج آنگن میں
زخم دیوار کا نکل آیا

دل کو خوش فہمیاں تو کیا کیا تھیں
آستینوں سے کیا نکل آیا

زندگی سے نبھاہ کیا کرتے
کام اتنا بڑا نکل آیا

ہم تری قربتوں کے عادی تھے
اور سفر دور کا نکل آیا

حرف شاخِ زباں سے ٹوٹ گئے
مجھ میں وہ بولتا نکل آیا

ہم نے آنکھوں میں چاند دیکھا تھا
خواب کتنا برا نکل آیا

شعر مفہوم سے ہوا روشن
اور غزل سے دِیا نکل آیا

سرخ پھولوں کے رنگ زرد ہوئے
میں ہَرے کا ہَرا نکل آیا

معجزہ تو جمال یار کا تھا
سنگ سے آئینہ نکل آیا

پھر ہوا یوں کہ اُس دریچے سے
چاند ہنستا ہوا نکل آیا

اک بھرم ٹوٹنے ہی والا تھا
پتھروں سے خدا نکل آیا

ذکر صحرا کا ہو رہا تھا قیسؔ
اور مِرا واقعہ نکل آیا

❁

لوگ چپ چپ ہیں مگر بولتے ہیں
تیرے لہجے کے اثر بولتے ہیں

وہ خموشی سے گذر جاتا ہے
پھر یہ دیواریں یہ در بولتے ہیں

ایسی خواہش مجھے پرواز کی ہے
میرے ٹوٹے ہوئے پر بولتے ہیں

کوئی پوچھے تو بتائیں ہم بھی
کیسے اجڑے ہوئے گھر بولتے ہیں

میرا جنگل میرے اندر ہے کہیں
مجھ میں تنہائی کے ڈر بولتے ہیں

حرف جب دل سے گزرتا ہے تو قیسؔ
میری پوروں کے ہنر بولتے ہیں

٭

ہر آفت کو ٹال دیا جائے
دکھ دریا میں ڈال دیا جائے

شور مچانے والی چیلوں کا
دل سے خوف نکال دیا جائے

آنکھیں کب سے چھت پر بیٹھی ہیں
کوئی چاند اچھال دیا جائے

آج تو بدلی کھل کر برسے گی
سورج کل پر ٹال دیا جائے

کوئی تارا بھیج مرے سائیں
سارا شہر اجال دیا جائے

اب جینے کی ایک ہی صورت ہے
دل مشکل میں ڈال دیا جائے

یہ عاشق تو پاگل پنچھی ہیں
کس کے ہاتھ میں جال دیا جائے

قیسؔ چمکنے والی آنکھوں کو
پیمانوں میں ڈال دیا جائے

جان قربان کون کرتا ہے
اپنا نقصان کون کرتا ہے

سب تری زلف کے حصار میں ہیں
پر یہ اعلان کون کرتا ہے

تیری قربت کسے عزیز نہیں
دل کو ویران کون کرتا ہے

لوگ تو مشکلوں میں ڈالتے ہیں
مشکل آسان کون کرتا ہے

تم تغافل اگر نہیں کرتے
تو مری جان کون کرتا ہے

بت پرستی تو ہم بھی کرتے ہیں
ترک ایمان کون کرتا ہے

اپنی اپنی ضرورتیں ہیں قیسؔ
ورنہ احسان کون کرتا ہے

ہر اک نقطے پہ اتنا سوچنا اچھا نہیں لگتا
پرندوں کی نظر سے دیکھنا اچھا نہیں لگتا

تمہارے بعد رشتے درد کے اچھے نہیں لگتے
کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنا اچھا نہیں لگتا

محبت کا وہ اِک لمحہ میسر ہو تو پھر کیا ہے
کسے کچے گھڑے پر تیرنا اچھا نہیں لگتا

ہماری بدحواسی کو نہ جانے لوگ کیا سمجھیں
کسی سے گھر کا رستہ پوچھنا اچھا نہیں لگتا

جو مجھ سے روز پریوں کی کہانی سن کے سوتے تھے
انہی بچوں کو میرا بولنا اچھا نہیں لگتا

جو خود اپنی رضا سے قیسؔ گر کر ٹوٹ جاتے ہیں
وہ مٹی کے کھلونے جوڑنا اچھا نہیں لگتا

ہجر تنہائی کے لمحوں میں بہت بولتا ہے
رنگ اس کا کئی رنگوں میں بہت بولتا ہے

میں اسے چپ کے حوالے سے بھی کیسے لکھوں
وہ تو ایسا ہے کہ حرفوں میں بہت بولتا ہے

ایک لو ہے کہ سر بام تھرکتی ہے بہت
اک دیا ہے کہ دریچوں میں بہت بولتا ہے

اپنی آواز سنائی نہیں دیتی مجھ کو
ایک سناٹا کہ گلیوں میں بہت بولتا ہے

ایک ہی لے سے ہے مانوس مرا تار نفس
ایک ہی سر میرے کانوں میں بہت بولتا ہے

چاٹ لیتی ہے مرا جسم مرے پیڑ کی دھوپ
میرا سایہ برے وقتوں میں بہت بولتا ہے

اکثر اوقات مری ذات کا اِک خالی پن
میری ٹوٹی ہوئی چیزوں میں بہت بولتا ہے

دل مرا اس کی طرح پھول کے مانند ہے قیسؔ
جو مری بند کتابوں میں بہت بولتا ہے

دل بہک جاتا ہے برسات کے ساتھ
ہم بگڑ جاتے ہیں حالات کے ساتھ

وہ مقدس ہے صحیفے کی طرح
حفظ ہو جاتا ہے آیات کے ساتھ

کتنے روشن ہیں در و بام خیال
ہم چمکنے لگے ذرات کے ساتھ

دشت جاں اور ترے درد کی لو
کون گزرا ہے مری رات کے ساتھ

یہ غنیمت ہے کہ ہم زندہ ہیں
لوگ مر جاتے ہیں عادات کے ساتھ

کوئی تدبیر فلک کی نہ چلی
ہم جواں ہو گئے آفات کے ساتھ

مصلحت سچ نہیں کہنے دیتی
لوگ بکتے ہیں کرامات کے ساتھ

ایک رغبت ہے مئے ناب سے قیسؔ
اک تعلق ہے خرابات کے ساتھ

وہم کیسا گمان میں بھی نہیں
تم فقیروں کے دھیان میں بھی نہیں

ہم دل دوستاں میں رہتے ہیں
تم تو اپنے مکان میں بھی نہیں

اب وہ پتھر کہاں سے آئے گا
اب ترا گھر چٹان میں بھی نہیں

ورنہ تم کو فروخت کر دیتے
تم ہماری دکان میں بھی نہیں

لوگ روشن ہیں اپنی مٹی سے
تم کسی خاکدان میں بھی نہیں

ہم تو اپنے پَروں پہ اُڑتے ہیں
تُم پرائی اُڑان میں بھی نہیں

آج کیا دھوپ تم کو چاٹ گئی
آج تم سائبان میں بھی نہیں

ایک راحت جو قربِ یار میں ہے
مے کدے کی امان میں بھی نہیں

اس کے لہجے میں وہ مٹھاس تھی قیسؔ
اپنی اردو زبان میں بھی نہیں

پتھر بھاری کیوں ہوتا ہے
درد سے عاری کیوں ہوتا ہے

کام آسان بھی ہو تو مجھ کو
اک دشواری کیوں ہوتا ہے

تم پر ہی مرتا ہے دل تو
پھر انکاری کیوں ہوتا ہے

تیر چلے تو اس کا نشانہ
ذات ہماری کیوں ہوتا ہے

شام ڈھلے تو ان آنکھوں سے
چشمہ جاری کیوں ہوتا ہے

قیس اب جینے کا مقصد بھی
وقت گزاری کیوں ہوتا ہے

کس کو تحریک ہے سفر کی یہاں
کوئی صورت نہیں مفر کی یہاں

اپنے جنگل میں مطمئن ہوں میں
ساری آسودگی ہے گھر کی یہاں

اک شرارت ہے موسموں کا نزول
اک اذیت ہے خشک و تر کی یہاں

بس پرندوں کو دیکھتے رہنا
کیسی خواہش ہے بال و پر کی یہاں

یہ کشش اور خاک میں اے دل
کیا کرامت ہے کوزہ گر کی یہاں

کتنا مبہم ہے شہر دل کا نظام
کیسی حالت ہے خیرو شر کی یہاں

ایک پر تو ترے جمال کا ہے
اک کمی ہے تری نظر کی یہاں

اب تو آنگن میں دھوپ ناچتی ہے
کیا گھنی چھاؤں تھی شجر کی یہاں

ایک لمحہ طویل ہے کتنا
زندگی کتنی مختصر ہے یہاں

قیسؔ کس سر کی بات کرتے ہو
کوئی قیمت نہیں ہے سر کی یہاں

وہ تو سارا بھیگ چکا تھا جو سامان کھلا تھا
غور سے دیکھا تو کمرے کا روشندان کھلا تھا

آج دریچے سے جب اس نے باہر جھانک کے دیکھا
اک دروازہ میرے دل کے اندر آن کُھلا تھا

اُسکے لہجے میں خوشبو تھی میرؔ کی غزلوں جیسی
اور میری دیوار کی اوٹ میں چمنستان کھلا تھا

تپتی ریت کا دریا تھا اپنے پیروں کے نیچے
اور کڑکتی دھوپ کا سر پر سائبان کھلا تھا

دل نے کیا کیا ڈھونگ رچائے کیا کیا جال بچھائے
ساون کی رت آ پہنچی تو اسکا دھیان کھلا تھا

برسوں میں مری آنکھوں میں اک برسات ہوئی تھی
برسوں بعد کسی سے ملنے کا امکان کھلا تھا

ہمسائے تک جا پہنچی تھیں گھر کی ساری باتیں
سوچ رہا ہوں میری کس دیوار کا کان کھلا تھا

دل کے پیچھے ایک گلی تھی بند دریچوں والی
اور آگے لمبی سوچوں کا اک میدان کھلا تھا

ہم نے کیا کیا روگ لگا رکھے تھے اس کی خاطر
تب ہم پر یہ بات کھلی جب دل کا مان کھلا تھا

شہر کے منظر منظر کو خاموشی چاٹ رہی تھی
اک ہمسائے کا کتا اور اک دربان کھلا تھا

قیسؔ محبت کر کے ملنا ولنا کیا تھا ہم کو
دل کے کاروبار میں اپنا ہی نقصان کھلا تھا

آرزوئے وصال یار کریں
کس کے آنے کا انتظار کریں

درد کے کس مقام سے گزریں
اپنا دریا کہاں سے پار کریں

کس سے کس موڑ پر بچھڑ جائیں
کونسا ہجر اختیار کریں

یہ جو اک زخم جاں پس جاں ہے
کس کے سینے کے آر پار کریں

فرصت شوق عمر آوارہ
آ تجھے آج شرمسار کریں

دل کی اونچی مچان پر بیٹھیں
اور کئی آرزو شکار کریں

مسئلہ یہ ہے کہ کس حوالے سے
کوئی خواہش سپرد یار کریں

کاش تم روز ہی مکر جاؤ
کاش ہم روز انتظار کریں

چاند چھت پر ضرور آئے گا
میری آنکھوں کا اعتبار کریں

ایک مشکل سی آپڑی ہے قیسؔ
تیری آنکھوں پہ کیا نثار کریں

دل میں کوئی ملال تو آتا ضرور ہے
اس آئینے میں بال تو آتا ضرور ہے

چُھپتی کہاں ہیں دل میں پرائی محبتیں
چہرے پہ رنگ لال تو آتا ضرور ہے

جس شخص کے وجود سے ہے زندگی کا شور
اس شخص کا خیال تو آتا ضرور ہے

ایسا نہیں ہے، ہجر کا منکر نہیں ہوں میں
پر موسمِ وصال تو آتا ضرور ہے

راہِ وفا کچھ اس قدر آسان بھی نہیں
جاں پر کوئی وبال تو آتا ضرور ہے

سود و زیاں کی فکر کسے ہے دل عزیز
ہر اوج کو زوال تو آتا ضرور ہے

وہ جس نے قیسؔ شہر کو پاگل بنا دیا
اس کو کوئی کمال تو آتا ضرور ہے

کوئی آہٹ کوئی صدا آئے
کھڑکیاں کھول دو ہوا آئے

پھر کوئی کنج چشم سے ابھرے
مجھ میں دریا اچھالتا آئے

آرزو ہے کسی حوالے سے
کوئی پیغام آپ کا آئے

پھر کسی بام سے کرن پھوٹے
اور مجھ تک ذرا ذرا آئے

میں تجھے سوچتا تو رہتا ہوں
اور محبت میں مجھ کو کیا آئے

کوئی آئے تو اس وقار سے قیسؔ
دل میں رستے نکالتا آئے

پھر گلی سے کوئی پاگل گزرے
مجھ کو لے جائے جو بادل گزرے

اس پہ بجتی ہے ترے ہجر کی دھوپ
جس کے سر سے ترا آنچل گزرے

جانے یہ شام کسے راس آجائے
کس کی آنکھوں سے یہ کاجل گزرے

کیا پتہ عشق میں ہم کیا ہوجائیں
ہم پہ کب وصل کا وہ پل گزرے

کب پسِ جاں وہ مہک جاگ اُٹھے
کب کوئی اوڑھ کے صندل گزرے

کھڑکیاں شور مچانے لگ جائیں
جب گلی سے مرا پاگل گزرے

اب کے ساون کی گھٹا آئے تو قیسؔ
میری آنکھوں سے بھی جل تھل گزرے

شام سہاگن اور میں پاگل
یہ پاگل پن اور میں پاگل

ہم دونوں کا ایک قبیلہ
وہ بیراگن اور میں پاگل

ایک جھروکے میں اک مورت
چاند کے درشن اور میں پاگل

من میں آشاؤں کے پتھر
کانچ کے برتن اور میں پاگل

اک چہرے میں سو سو چہرے
دل سا درپن اور مَیں پاگل

کانوں میں اک راگ ملن کا
چھن چھن چھن چھن اور میں پاگل

اک اک انگ میں روپ کی دھارا
رادھا کا تن اور میں پاگل

دریاؤں پر پیاس کے پہرے
اکھیاں ساون اور میں پاگل

پریم نگر کے باسی اندھے
پریت ابھاگن اور میں پاگل

کاغذ پر اِک نام غزل کا
پوروں میں فن اور میں پاگل

من مندر میں قیسؔ اک دیوی
عشق برہمن اور میں پاگل

ہوا کے نام کچھ تحریر کرنا
غزل میں روشنی تعمیر کرنا

دلوں کا شوق اک آبِ رواں ہے
کسی پاگل کو مت زنجیر کرنا

وہ جس کو لوحِ دل پر لکھ دیا ہو
اسے پتوں پہ کیا تحریر کرنا

جو رستا ہی نہیں وہ زخم کیسا
عبث ہر زخم کی تفسیر کرنا

یہ کیا ویران کر دینا دلوں کو
کھنڈر میں بستیاں تعمیر کرنا

پرندوں سے یہی سیکھا ہے ہم نے
ہوا میں راستے تسخیر کرنا

ہمارا شوق ہے پتھر جہاں ہوں
وہیں شیشے کا گھر تعمیر کرنا

جسے دل کچھ زیادہ چاہتا ہو
اسے ملنے کی بھی تدبیر کرنا

ابھی دریا کہاں دیکھے ہیں تم نے
تو کیا کچے گھڑے تعمیر کرنا

یہی تو رہ گیا ہے زندگی میں
تجھے ملنا تجھے تصویر کرنا

انہی سے قیسؔ سائے ہیں سروں پر
درختوں کی بڑی توقیر کرنا

جب محبت سنوار دیتی ہے
پانیوں میں اتار دیتی ہے

روشنی کو ترے دریچوں کے
آئینوں سے گزار دیتی ہے

لڑکیوں کو گھڑے نہیں دیتی
جبر کو اختیار دیتی ہے

جن پرندوں کے پر نہیں ہوتے
ان پہ خوشبو اتار دیتی ہے

یہ محبت عجیب چیز ہے قیسؔ
دل کی مٹی نکھار دیتی ہے

کسی گلی سے ہوا بھی کوئی نہیں آئی
میں انتظار میں تھا وہ گھڑی نہیں آئی

تمام رات وہ آنکھوں کے سامنے ہی رہا
تمام رات مجھے نیند ہی نہیں آئی

میرا نصیب ہی مجھ کو خراب کرتا ہے
ترے خلوص میں کوئی کمی نہیں آئی

کسی طریقے سے وہ چاند بھی نہیں اترا
ہمارے گھر میں کوئی روشنی نہیں آئی

پلٹ پلٹ کر وہ دریا بلا رہا تھا قیسؔ
میں کیا کروں مجھے آواز ہی نہیں آئی

یہ مرے ڈھول سہانے سائیں
آ کوئی ضرب لگانے سائیں

کس کی خوشبو سے معطر ہے دماغ
کون بیٹھا ہے سرہانے سائیں

دے کسی درد کی سوغات مجھے
آج بھر دے مرے خانے سائیں

پھر وہی چاند نئے موسم کا
پھر وہی روگ پرانے سائیں

تجھ سے بچھڑے ہیں تو کیا لوگ ہیں ہم
لگ گئے شور مچانے سائیں

اک شررِ قیسؔ ابھی راکھ میں ہے
آ کبھی اس کو بجھانے سائیں

درد کو اتنا اچھالا جائے گا
آنکھ سے دریا نکالا جائے گا

سوچتے ہیں اب تجھے ملنے کے بعد
دل کو کس مشکل میں ڈالا جائے گا

تو بتا اے زندگی ہم کیا کریں
کونسی آفت کو ٹالا جائے گا

دیکھ لینا ایک دن اے دل تجھے
زہر دے کر مار ڈالا جائے گا

کب مجھے دیکھے گا آئینہ مرا
کب مِرے کمرے کا جالا جائے گا

دل میں اک تعمیر کر لی جائے گی
زخم سے روزن نکالا جائے گا

ہم یہ آنکھیں بھی جلا ڈالیں تو قیسؔ
راکھ سے اب کیا نکالا جائے گا

چاند مشرق سے نکلتا نہیں دیکھا میں نے
تجھ کو دیکھا ہے تو تجھ سا نہیں دیکھا میں نے

حادثہ جو بھی ہو چپ چاپ گزر جاتا ہے
دل سے اچھا کوئی رستہ نہیں دیکھا میں نے

پھر دریچے سے وہ خوشبو نہیں پہنچی مجھ تک
پھر وہ موسم کبھی دل کا نہیں دیکھا میں نے

موم کا چاند ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہوں
شہر میں دھوپ کا میلہ نہیں، دیکھا میں نے

چڑھتے سورج کی شعاعوں نے مجھے پالا ہے
جو اتر جائے، وہ دریا نہیں دیکھا میں نے

پھر مرے پاؤں کی زنجیر ہلا دے کوئی
کب سے اس شہر کا رستہ نہیں دیکھا میں نے

مجھ کو پانی میں اترنے کی سزا دیتا ہے
وہ سمجھتا ہے کہ دریا نہیں دیکھا میں نے

قیسؔ کہتے ہیں فقیروں پہ بہت بھونکتا ہے
اپنے ہمسائے کا کتا نہیں دیکھا میں نے

شام کے آثار گیلے ہیں بہت
پھر مری آنکھوں میں تیلے ہیں بہت

تم سے ملنے کا بہانہ تک نہیں
اور بچھڑ جانے کے حیلے ہیں بہت

کشت جاں کو خشک سالی کھا گئی
موسموں کے رنگ پیلے ہیں بہت

برف پگھلی ہے فراز عرش سے
آسماں کے رنگ نیلے ہیں بہت

بیل کی صورت ہیں ہم پھیلے ہوئے
ہم فقیروں کے وسیلے ہیں بہت

میں بھی اپنی ذات میں آباد ہوں
میرے اندر بھی قبیلے ہیں بہت

لوگ بستی کے بھی ہیں شیریں صفت
میرے نغمے بھی رسیلے ہیں بہت

قیسؔ ہم جوگی ہیں اپنے شہر کے
ناگ تو ہم نے بھی کیلے ہیں بہت

بیٹھ جاتا ہے آ کے پاس بہت
ہم کہ بندے ہیں بدحواس بہت

لوٹ جاتی ہے دستکیں دے کر
تیرے ملنے کی ایک آس بہت

پھول جیسے ہیں عشق کے آزاد
پھیل جاتی ہے ان کی باس بہت

میری سب تلخیوں کو چاٹ گیا
اس کے لہجے میں تھی مٹھاس بہت

اسکی آنکھوں میں اک بشارت تھی
مجھ میں اگنے لگے ہراس بہت

میں اسے انگلیوں پہ گنتا رہا
وہ بھی بنتا رہا لباس بہت

اسکی پوروں میں اک شرارت تھی
رقص کرتے رہے گلاس بہت

چاند کھڑکی میں یوں نہیں آتا
ہم جو کرتے ہیں التماس بہت

ہم گلی کے فقیر ہیں بابا
دھوپ آتی ہے ہم کو راس بہت

ہم معمہ تھے حل کہاں ہوتے
لوگ کرتے رہے قیاس بہت

قیسؔ وہ چپ تھا روشنی کی طرح
ہم بھی بیٹھے رہے اداس بہت

چاند کا کوئی حوالہ ہی نہیں
کہیں بستی میں اجالا ہی نہیں

مجھ کو کیا خاک دکھائی دیتا
میری دیوار پہ جالا ہی نہیں

روز ہی دیر سے گھر آتا ہوں
اب کوئی پوچھنے والا ہی نہیں

رات دہلیز پہ آ بیٹھی ہے
ہم نے وہ چاند اچھالا ہی نہیں

کس کے جنگل کے سفر پر نکلوں
پاؤں میں اب ترا چھالا ہی نہیں

جس کو اپنوں کی نظر سے دیکھا
پھر اسے دل سے نکالا ہی نہیں

کسی تارے نے اسے بھیک نہ دی
چاند کے پاس پیالہ ہی نہیں

کون دیکھے تری نظروں سے مجھے
اب کوئی دیکھنے والا ہی نہیں

قیسؔ جو حرف کو روشن نہ کرے
وہ شرر راکھ میں ڈالا ہی نہیں

کبھی خوشبو کبھی رنگ حنا تھی
حکایت سلسلہ در سلسلہ تھی

ہم اتنے بے خبر بھی تو نہیں تھے
محبت اک ضروری واقعہ تھی

مجھے اسکی وفا نے مار ڈالا
مری آوارگی کی انتہا تھی

دیے کی لو کا منظر دیکھنے کو
در و دیوار تھے میں تھا ہوا تھی

مرے بچوں نے فاقہ تک نہ دیکھا
مرے کشکول میں ماں کی دعا تھی

مجھے بھی قیسؔ سچ ہی بولنا تھا
مرے دشمن کی خصلت بھی جدا تھی

روشنی زنجیر ہم کیسے کریں
چاند کو تحریر ہم کیسے کریں

ایک مشکل آ پڑی ہے دوستو!
خاک کو اکسیر ہم کیسے کریں

اب کہ کارِ عشق سے آزاد ہیں
اب کوئی تقصیر ہم کیسے کریں

کوئی چہرہ ہے نہ اب کوئی چراغ
شہر میں تنویر ہم کیسے کریں

لائقِ توقیر تو تھا ہی نہیں
پھر تری توقیر ہم کیسے کریں

انگلیاں ہی بیچ ڈالی ہیں تو قیسؔ
رنگ کو تصویر ہم کیسے کریں

✿

تیری خوشبو میں تیرتے ہیں لوگ
اپنے پانی کے بلبلے ہیں لوگ

اک دیا بھی نہیں دریچے میں
شام ہی سے بجھے ہوئے ہیں لوگ

چاند کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں
اور بہت خواب دیکھتے ہیں لوگ

روشنی کے حصار میں ہوں میں
آئینوں میں جڑے ہوئے ہیں لوگ

روز سورج سے بھیک مانگتے ہیں
بارشوں سے ڈرے ہوئے ہیں لوگ

اب یہاں کون آنے والا ہے
کیوں دریچے سے جھانکتے ہیں لوگ

اس کی آنکھوں میں چاند اترتا ہے
اس کو حیرت سے دیکھتے ہیں لوگ

شب کو سورج تلاش کرتے ہیں
اپنے پیچھے پڑے ہوئے ہیں لوگ

کس تکلف سے بات کرتے ہیں
کس مروت سے بھونکتے ہیں لوگ

قیسؔ لوگوں سے خوف آتا ہے
اپنے قد سے بڑے بڑے ہیں لوگ

کوئی ایسی گھڑی نہیں ہوتی
جب مصیبت کھڑی نہیں ہوتی

اپنا اِدراک تک نہیں ہوتا
آنکھ جب تک لڑی نہیں ہوتی

یہ محبت عجیب ہے سائیں
کس کے دل میں جڑی نہیں ہوتی

زندگی جو بھی ہو سو ہو لیکن
موتیوں کی لڑی نہیں ہوتی

اب جوانی کہاں تلاش کریں
میکدے میں پڑی نہیں ہوتی

ہم بڑھا کر بیان کرتے ہیں
بات اتنی بڑی نہیں ہوتی

کون آرام سے ہے قیسؔ یہاں
کس کو مشکل پڑی نہیں ہوتی

چاند راتاں اندھیریاں ہو جائیں
عشق میں سرد مہریاں ہو جائیں

کل کا سورج شمال سے نکلے
وقت کی ہیرا پھیریاں ہو جائیں

آؤ رندو! چلو طواف کریں
آج گلیوں کی پھیریاں ہو جائیں

یہ بصارت ترے لیے ہی تو ہے
میری آنکھیں بھی تیریاں ہو جائیں

یا الٰہی یہ کیا مصیبت ہے
میرے کاموں میں دیریاں ہو جائیں

قیسؔ خوشبو غزل پہ ناز کرے
حرف پھولوں کی ڈھیریاں ہو جائیں

سونے کے دل مٹی کے گھر پیچھے چھوڑ آئے ہیں
وہ گلیاں وہ شہر کے منظر پیچھے چھوڑ آئے ہیں

اپنے آئینوں کو ہم نے روگ لگا رکھا ہے
کیا کیا چہرے ہم شیشہ گر پیچھے چھوڑ آئے ہیں

تم اپنے دریا کا رونا رونے آجاتے ہو
ہم تو اپنے سات سمندر پیچھے چھوڑ آئے ہیں

دیکھو ہم نے اپنی جانوں پر کیا ظلم کیا ہے
پھول سا چہرہ چاند سا پیکر پیچھے چھوڑ آئے ہیں

ہم بھی کیا پاگل تھے اپنے پیار کی ساری پونجی
اسکی اک اک یاد بچا کر پیچھے چھوڑ آئے ہیں

منزل سے اب دور نکل آئے ہیں قیسؔ تو خوش ہیں
ہمسائے کے کتے کا ڈر پیچھے چھوڑ آئے ہیں

نہ میں اچھا نہ مرا خواب سہانا اچھا
رتجگوں کا اے شب ہجر زمانا اچھا

دل پژمردہ کی سوکھی ہوئی ٹہنی اچھی
تن آزردہ پہ ملبوس پرانا اچھا

بھوک ایسی ہے کہ اب سیر شکم پھرتا ہوں
ہے مرے رزق میں شامل کوئی دانا اچھا

جیت اب کے بھی تو آوارۂ فن کی ہوگی
وہی ہارے گا کہ ہے جس کا نشانا اچھا

اشک آنکھوں سے نہ ٹپکے تو عجب چیز ہے قیسؔ
دل میں رہ جائے تو اک زخم پرانا اچھا

ضربِ حالات کچھ نہیں ہوتی
رنج کی بات کچھ نہیں ہوتی

جس میں دل کا زیاں نہیں ہوتا
وہ ملاقات کچھ نہیں ہوتی

وہ جو شایانِ شانِ فقر نہ ہو
ایسی خیرات کچھ نہیں ہوتی

بد سرشتی لہو میں ہوتی ہے
بات میں بات کچھ نہیں ہوتی

زعم تو آستیں کا ہوتا ہے
سانپ کی ذات کچھ نہیں ہوتی

لوگ جو با وفا نہیں ہوتے
اُنکی اوقات کچھ نہیں ہوتی

ایک وقفہ وصال کا ہے فقط
ہجر کی رات کچھ نہیں ہوتی

جب سے آنکھیں اجڑ گئی ہیں قیسؔ
گھر میں برسات کچھ نہیں ہوتی

اسی کا غم کہ خوشی مجھ کو راس کیسی تھی
وہ ابر کیسا تھا اور مجھ کو پیاس کیسی تھی

یہ سوچتا ہوں تہی دست لوگ کیسے تھے
متاعِ درد جو تھی ان کے پاس کیسی تھی

یونہی سہی! کہ تجھے مل کے ہم اداس نہیں
مگر وہ آرزوئے بے لباس کیسی تھی

مرا بدن کسی دھرتی کا رزق تھا شاید
مرے وجود پہ زخموں کی گھاس کیسی تھی

وہ اک ملال سا جاں پر محیط کیسا تھا
وہ اک طلب سی مرے آس پاس کیسی تھی

ہر ایک بات پہ دل ڈوب جاتا تھا
یہ شام ہی سے ان آنکھوں کو آس کیسی تھی

میں اک تصورِ شیریں میں گھل رہا تھا قیسؔ
کسے خبر میرے لب پر مٹھاس کیسی تھی

وہ جیسا ہے میں ایسا کیوں نہیں ہوں
زمانے کو سمجھتا کیوں نہیں ہوں

مری خاطر وہ کتے پالتا ہے
میں ہمسائے سے ڈرتا کیوں نہیں ہوں

یہ میری کشت جاں محدود کیوں ہے
میں اپنی ساری دنیا کیوں نہیں ہوں

برائی ہے یہاں سچ بولنا بھی
مرے مولا! میں اچھا کیوں نہیں ہوں

در و دیوار بھی نالاں ہیں مجھ سے
میں اپنے گھر میں رہتا کیوں نہیں ہوں

مجھے اس نے پکارا تو بہت تھا
تعجب ہے میں جاگا کیوں نہیں ہوں

نہ جانے قیسؔ مجھ میں کیا کمی ہے
دیے کے ساتھ جلتا کیوں نہیں ہوں

اپنے گل چیں سے گلہ کیا کرتی
باغ میں شاخ حنا کیا کرتی

تیز تھی دھوپ مگر ہار گئی
پھول سے رنگ جدا کیا کرتی

میں اسے حفظ تھا پانی کی طرح
پھر وہ لہروں پہ لکھا کیا کرتی

خشک سالی میرے اندر تھی کہیں
شہر کی آب و ہوا کیا کرتی

کھا گیا جبر سماعت مجھ کو
میرے گنبد کی صدا کیا کرتی

میں تو ہونٹوں سے گرا پڑتا تھا
پھر مری ماں کی دعا کیا کرتی

قیسؔ پتھرائی ہوئی چیز تھے ہم
اور وہ پتھر سے وفا کیا کرتی

❀

نظر میں رنگ سمائے ہوئے اُسی کے ہیں
یہ سارے پھول اگائے ہوئے اُسی کے ہیں

اسی کے لطف سے بستی بحال ہے ساری
تمام پیڑ لگائے ہوئے اسی کے ہیں

اسی کے حسن کی پرچھائیاں ہیں پتوں پر
زمیں نے بوجھ اٹھائے ہوئے اسی کے ہیں

وہ جس کے قرب سے حرف وصال ہے روشن
مرے چراغ جلائے ہوئے اسی کے ہیں

یہ بارشیں بھی اسی کی ہیں میری آنکھوں میں
یہ ابر ذہن پہ چھائے ہوئے اسی کے ہیں

یہ آگہی جو ہمیں یوں ہمارے حال کی ہے
یہ سب کمال سکھائے ہوئے اُسی کے ہیں

یہ توڑ پھوڑ غزل میں اسی کے نام کی ہے
یہ سارے شور مچائے ہوئے اسی کے ہیں

ہمارے لہجے میں جو اک مٹھاس ہے باقی
ہمیں یہ زہر پلائے ہوئے اسی کے ہیں

بجز جمال ہمیں اور کیا دکھائی دے
نظر پہ پہرے بٹھائے ہوئے اسی کے ہیں

اسی جبیں سے نکلتا ہے قیسؔ چاند مرا
یہ آسمان سجائے ہوئے اسی کے ہیں

دل کو کعبہ بنا کے رکھتے ہیں
پتھروں کو سجا کے رکھتے ہیں

اپنے جنگل میں ہم نہیں جاتے
پر ارادے بلا کے رکھتے ہیں

اپنی مٹی سے پھوٹتے ہیں ہم
اور کرشمے ہوا کے رکھتے ہیں

خاک اڑاتے ہیں اپنی آنکھوں کی
تیرے منظر سجا کے رکھتے ہیں

کچھ تو لطف نزول ہے ہم پر
کچھ اثر ہم دعا کے رکھتے ہیں

ہم کوئی بے ثمر درخت نہیں
اپنے سر کو جھکا کے رکھتے ہیں

جن کا مسلک منافقت ہو قیسؔ
اصلی چہرے چھپا کے رکھتے ہیں

❁

منظروں کی بھیڑ میں الجھا دیا
آنکھ نے مجھ کو کہاں دفنا دیا

سر سے سائے کی طلب بھی چھین لی
دھوپ نے مجھ پر کرم فرما دیا

کام آنے لگ گئیں نیرنگیاں
اسکے رنگوں نے مجھے چمکا دیا

آرزو جاگی لباس شوق میں
رات نے مجھ کو بدن پہنا دیا

درد کو الٹا پہن کر سو گئے
زخم کو دیوار میں چنوا دیا

ہم ہوا کے ساتھ چل کر تھک گئے
خواہشوں نے دور تک پھیلا دیا

آنکھ میں زنجیر حیرت ڈال دی
پھر تری دیوار نے دھوکا دیا

دشمنوں میں قیسؔ جرأت ہی نہ تھی
دوستوں نے دار تک پہنچا دیا

٭

آنکھ میں زخم تر تو رہتا ہے
ہجرتوں کا ثمر تو رہتا ہے

دل میں جب راستہ نکل آئے
زندگی کا گزر تو رہتا ہے

کوزہ گر کا کمال ہے شاید
راکھ میں اک شرر تو رہتا ہے

ہاں تری جستجو تو رہتی ہے
آدمی در بدر تو رہتا ہے

ہر دیے کو خبر نہیں ہوتی
روشنی کا سفر تو رہتا ہے

ہم مسافر ہیں اور جانتے ہیں
راستے میں شجر تو رہتا ہے

اتفاقاً کبھی کبھی ہی سہی
آدمی اپنے گھر تو رہتا ہے

جن کا کردار ہو مثالی قیسؔ
ان کا نیزے پہ سر تو رہتا ہے

کسی کی آرزو پالی نہ جائے
بری عادت کوئی ڈالی نہ جائے

طبیعت ہے کہ پتھر پر دھری ہے
کسی سانچے میں بھی ڈھالی نہ جائے

سبھی رنگوں کو سورج کھا گیا ہے
بس اپنے خون کی لالی نہ جائے

نہ جانے کون گزرا تھا ادھر سے
مرے آنگن کی ہریالی نہ جائے

یہ کار شوق تو کار زیاں ہے
یہ عادت دیکھنے والی نہ جائے

مجھے یہ مشورہ دل نے دیا تھا
نظر کا وار ہے خالی نہ جائے

بس اتنا جانتے ہیں قیسؔ ہم تو
محبت کی بلا ٹالی نہ جائے

روز ہوا میں اڑنے کی فرمائش ہے
یہ میری مٹی میں کیسی خواہش ہے

چہرہ چہرہ گم ہے اپنے منظر میں
اور آنکھوں کے پیچھے ایک نمائش ہے

اک تیری آواز نہیں آتی ورنہ
چھوٹے سے اس گھر میں ہر آسائش ہے

اب کے ساون آئے تو تم آ جانا
سارے بستی والوں کی فرمائش ہے

اک دن شیش محل سے باہر بھی دیکھو
خیمے کی بھی اپنی ایک رہائش ہے

ان رنگوں کو سورج کھا جاتا ہے قیسؔ
جن رنگوں میں تھوڑی سی آلائش ہے

یہ جو تیری گلیوں کے راستے نکلتے ہیں
یہ تو ہم فقیروں ہی کے لیے نکلتے ہیں

اس کے لمس کی ہم کو تازگی میسر ہے
ہم اجاڑ لوگوں کے دل ہرے نکلتے ہیں

بے صدا لکیروں میں ربط بھی ضروری ہے
حرف باثمر ہو تو ذائقے نکلتے ہیں

اس کی انگلیاں میری ہر غزل کو بنتی ہیں
یعنی استعارے سب شعر سے نکلتے ہیں

اس کے روبرو ہو کر میں دکھائی دیتا ہوں
جیسے اس کی مٹی سے آئینے نکلتے ہیں

وہ چراغ کی صورت راستے میں مل جائے
ہم دعائیں مانگتے مانگتے نکلتے ہیں

ایک شکل بنتی ہے اِک چراغ جلتا ہے
آنکھ کے دریچوں سے دائرے نکلتے ہیں

روز میرے سینے سے اک غبار اٹھتا ہے
روز دل کی بستی سے قافلے نکلتے ہیں

شام ہی کو کھلتے ہیں مے کدے کے دروازے
آنکھ بند کر لیں تو رتجگے نکلتے ہیں

کس سفر پہ جانا ہے یہ کبھی نہیں سوچا
لوگ روز بستی سے پوپھٹے نکلتے ہیں

چیخ چیخ اٹھتی ہیں یہ چناب کی لہریں
لڑکیوں کی قسمت میں جب گھڑے نکلتے ہیں

ہم بھی تو شناور ہیں دشت جبرِ ہجراں کے
جب ہمارا جی چاہے تیرتے نکلتے ہیں

کون چشم گیتی میں حیرتیں سجاتا ہے
کانچ کے بدن کیسے خاک سے نکلتے ہیں

قیسؔ عمر رفتہ کی اک عجیب عادت ہے
لوگ اپنے بچپن کو ڈھونڈنے نکلتے ہیں

حیرتوں کے جہان میں رہنا
ہر گھڑی اپنے دھیان میں رہنا

کتنی آسائشوں میں رہنا ہے
اپنے کچے مکان میں رہنا

رات بھر چاند کے تعاقب میں
صبح تک آسمان میں رہنا

جانے وہ کب خریدنے آجائے
روز اپنی دکان میں رہنا

خواہش وصل سے گذر جانا
ہجر کے امتحان میں رہنا

اپنی مٹی سے ہم نے سیکھا ہے
جسم کے خاکدان میں رہنا

پتھروں کے لیے بشارت ہے
اپنی اپنی چٹان میں رہنا

سارا منظر فریب منظر ہے
اب کسے سائبان میں رہنا

اس کو توہین حرف کہتے ہیں
بے ہنر کی زبان میں رہنا

ہم کو تو راس ہی نہیں آیا
مے کدے کی امان میں رہنا

قیسؔ کتنا عجیب لگتا ہے
تیر کا ہر کمان میں رہنا

خوشی ملی تو بہت ہی اداس بیٹھے رہے
چلا گیا وہ تو ہم اس کے پاس بیٹھے رہے

جمال یار کی لذت بیان کیا کرتے
نظر میں شوق بدن میں ہراس بیٹھے رہے

برہنگی ہی کچھ ایسی تھی شہر غربت کی
قبا پہن کے بھی ہم بے لباس بیٹھے رہے

یہ واقعہ مری آنکھوں کے سامنے کا ہے
شراب ناچ رہی تھی گلاس بیٹھے رہے

اسی کو حسن نظر کا کمال کہتے ہیں
تمام شب ترے لذت شناس بیٹھے رہے

ٹھہر ٹھہر کے وہ دریا بلا رہا تھا قیسؔ
ہم اپنی آنکھوں میں بھر بھر کے پیاس بیٹھے رہے

مائل کسب وفا میں تو ہوا
تم پہ سو جاں سے فدا میں تو ہوا

ایک ٹکڑا چاند کا تم تو ہوئے
ایک سایہ ابر کا میں تو ہوا

رکھ لیا دیوار نے اس کا بھرم
ساری بستی میں برا میں تو ہوا

جھیلتا رہتا ہوں چہروں کے عذاب
یعنی اپنا آئینہ میں تو ہوا

مجھ کو بھی کھینچا گیا ہے دار پر
یوں کہو سچ کی صدا میں تو ہوا

وہ تو اپنی آرزو کا تھا اسیر
اس کے غم میں مبتلا میں تو ہوا

قیسؔ مجھ سے ہیں یہ سب آزادیاں
اس صدی کا سانحہ میں تو ہوا

سفر کب طے ہوا ہے
ابھی دریا پڑا ہے

ادھر سے بھی تو گزرو
زمانہ ہو گیا ہے

دریچے بولتے ہیں
کتابوں میں لکھا ہے

تم اچھی لگ رہی ہو
تمہارا نام کیا ہے

میں روشن ہو رہا ہوں
مجھے کیا ہو گیا ہے

گلی سے مت گزرنا
یہ رستہ دور کا ہے

تمہیں اب کیا بتائیں
ہمارے دل میں کیا ہے

بس اک ہم کیا برے ہیں
زمانہ ہی برا ہے

میں اس کا وہ نہیں ہوں
وہ کوئی دوسرا ہے

یہ ہم جو سن رہے ہیں
بس اک شور ہوا ہے

جسے تم چھو گئے تھے
وہی پتا ہرا ہے

ہوا میں قیسؔ جلنا
بہت اچھا لگا ہے

اے خوشا! ہمسروں کی بات کریں
اپنے کچے گھڑوں کی بات کریں

جن کا مسلک منافقت ہے فقط
آؤ ان بزدلوں کی بات کریں

اک اذیت لہو میں دوڑا دیں
کھولتے پانیوں کی بات کریں

ان کہی داستان دہرائیں
اجنبی حیرتوں کی بات کریں

کوئی چہرہ تراش لیں دل میں
حسن کے زاویوں کی بات کریں

لب و رخسار سے گزر جائیں
پھول کی پتیوں کی بات کریں

کوئی آنچل ہوا میں لہرا دیں
تتلیوں کے پروں کی بات کریں

وہ جہاں چاند روز ڈھلتا ہے
آؤ ان کھڑکیوں کی بات کریں

روشنی ہی کہیں سے آجائے
ان ہری چوڑیوں کی بات کریں

وصل کی دھوپ میں پگھل جائیں
ہجر کی بارشوں کی بات کریں

ذکر چھیڑیں بدن بدن اس کا
کانچ کے برتنوں کی بات کریں

رات کی آنکھ میں اتر جائیں
اور تری کاکلوں کی بات کریں

روشنی مانگ لیں ستاروں سے
چاند کی بیٹیوں کی بات کریں

آرزوؤں کی چھت پہ جا بیٹھیں
گاؤں کی لڑکیوں کی بات کریں

پھر کسی دھوپ کے حوالے سے
گم شدہ سورجوں کی بات کریں

اپنی دریافت بھی ضروری ہے
بے ثمر چاہتوں کی بات کریں

جو کبوتر اچھالتے ہیں قیسؔ
کاش اپنی چھتوں کی بات کریں

❁

دشت غربت میں بسر کیسے ہوئی
شام ہجراں کی سحر کیسے ہوئی

روزن جاں میں جو اک تصویر تھی
نقش بر دیوار و در کیسے ہوئی

چاند ہم سے پوچھتا ہی رہ گیا
روشنی نا معتبر کیسے ہوئی

جانے والا شخص تو بس ایک تھا
ساری بستی در بدر کیسے ہوئی

اب یہ سمجھا ہوں ترے جانے کے بعد
روشنی دیوار پر کیسے ہوئی

ہم نظر کو عمر بھر روتے رہے
آشنائے بام و در کیسے ہوئی

پھولتے پھلتے رہے سینے کے داغ
دل کی نادانی ہنر کیسے ہوئی

آئینہ تو تھا ہمارے ہاتھ میں
پتھروں کو یہ خبر کیسے ہوئی

بے ارادہ پھول کیوں مرجھا گئے
بے ثمر شاخ شجر کیسے ہوئی

قیسؔ بادل بھی نہیں تھا آنکھ میں
گھر میں بارش رات بھر کیسے ہوئی

روز و شب کی خماریاں کیا ہیں
دل میں باد بہاریاں کیا ہیں

یہ جو آنکھوں کی عندلیبیں ہیں
یہ محبت کی ماریاں کیا ہیں

جس کا ہونا اُسی کا ہو جانا
ہم فقیروں کی یاریاں کیا ہیں

روز اک پھول روز اک چہرہ
یہ تری سبز باریاں کیا ہیں

رات الٹی پہن کے سو جانا
خواہشیں بھی ہماریاں کیا ہیں

رات سورج تراشتے رہنا
دن کو اختر شماریاں کیا ہیں

ہم کہ آباد ہی نہیں ہوتے
یہ تری ہمکناریاں کیا ہیں

ہجرتوں کا عذاب کاٹا ہے
قیس گھڑیاں گزاریاں کیا ہیں

پتا پتا ہرا ہے میرے ساتھ
دل مرا جھومتا ہے میرے ساتھ

وہ محبت تو اب نہیں باقی
واقعہ رہ گیا ہے میرے ساتھ

میں بکھرنے میں دیر کیا کرتا
میری پاگل ہوا ہے میرے ساتھ

عکس پڑتا ہے چاند کا مجھ میں
وہ مجھے دیکھتا ہے میرے ساتھ

مرا گجرات ہے مرے اندر
میرا کچا گھڑا ہے میرے ساتھ

یہ مرا دل چراغ ہے میرا
رات بھر جاگتا ہے میرے ساتھ

عمرِ رفتہ شناخت ہے میری
میری ماں کی دُعا ہے میرے ساتھ

قیسؔ میں اس لیے قد آور ہوں
ایک بونا کھڑا ہے میرے ساتھ

سبز شاخِ وصال ہے سائیں
وجد میں ڈال ڈال ہے سائیں

سرخ پھولوں کی بیل ہے دنیا
خون کا رنگ لال ہے سائیں

منظر جاں میں خاک اڑتی ہے
عشق باد شمال ہے سائیں

یہ جو تو رات بھر نہیں سوتا
تیرے شیشے میں بال ہے سائیں

روشنی ہی نہیں رہی گھر میں
تو دیا تھا! کمال ہے سائیں

دولت درد نے سمیٹ اسے
یہ غنیمت کا مال ہے سائیں

موت سے تو مفر کسی کو نہیں
زندگی کا سوال ہے سائیں

تو نے کس کی رہائی دیکھی ہے
یہ محبت کا جال ہے سائیں

اب تعلق فروخت ہوتے ہیں
اب وفاؤں کا کال ہے سائیں

اپنی دنیا میں کون اپنا ہے
تم کو کس کا ملال ہے سائیں

ہجرتوں کا وبال ہے اے قیس
آرزوئے وصال ہے سائیں

سینہ لال گلال کیا جائے
کوئی زخم بحال کیا جائے

آؤ چل کر جشن مناتے ہیں
اپنا استقبال کیا جائے

ہم کو تو یہ بھی معلوم نہیں
کیسے ہجر وصال کیا جائے

ایک مسلسل شب آزادی ہے
کوئی دیا ارسال کیا جائے

اس پاگل کو پتھر مارے جائیں
دل کا ایسا حال کیا جائے

اس سے مِلنا بہت ضروری ہے
آنکھوں کو کنگال کیا جائے

کس قربت کی خیر منائیں ہم
کس لمحے کو سال کیا جائے

قیسؔ غزل کا مان بڑھانا ہے
لفظوں کو سر تال کیا جائے

ٹوٹ جانے کا بھی امکان تھا تم جانتے تھے
دل میں سب کانچ کا سامان تھا تم جانتے تھے

راحت قرب رفاقت کے سبب زندہ ہیں
ورنہ جینا کہاں آسان تھا تم جانتے تھے

لذت درد سے سیراب مجھے اس نے کیا
مجھ پہ اک شخص کا احسان تھا تم جانتے تھے

کوئی آواز بھی پتھر نہیں کرتی تھی مجھے
اپنے جنگل کا میں سلطان تھا تم جانتے تھے

کتنا مشکل تھا کسی بت کی پرستش کرنا
میں تو کافر بھی مسلمان تھا تم جانتے تھے

زندگی میرے تصرّف میں تھی وہ کیا کرتا
میری بنیاد میں طوفان تھا تم جانتے تھے

اپنے ہاتھوں سے لکھوں اور تمہیں روز پڑھوں
دل میں بس ایک ہی ارمان تھا تم جانتے تھے

ہمسفر اسکے تھے سب رخت سفر بھی اسکا
میں تو بس بے سرو سامان تھا تم جانتے تھے

اب اسے درد کی دہلیز پہ چھوڑ آئے ہو
وہ تو ہارا ہوا انسان تھا تم جانتے تھے

جس کی خوشبو سے معطر میرے اشعار تھے قیسؔ
ایک ہی پھول مری جان تھا تم جانتے تھے

راہ کے پتھروں سے بھاری ہے
ہم نے کیا زندگی گزاری ہے

رات الٹی پہن کے سوتا ہوں
ہجرتوں کا عذاب جاری ہے

ہم تو بازی لگا کے ہار چکے
دوستو! اب تمہاری باری ہے

مجھ پہ پھولوں کا قرض ہے میں نے
زندگی شاخ سے اتاری ہے

سوچتا ہوں کہ تھک گیا ہوں میں
تیری جانب سفر بھی جاری ہے

یہ جو ہم تم کو بھول جاتے ہیں
اک تعلق کی استواری ہے

اب زمانہ بدل گیا ہے قیس
اب محبت بھی اختیاری ہے

❁

ہوا کو خاک پتہ ہے، ہوا کو کیا معلوم
شجر وہیں پہ کھڑا ہے، ہوا کو کیا معلوم

یہ ہم جو ہیں نا! ابھی فرصت خیال میں ہیں
یہ وقت ٹھہرا ہوا ہے، ہوا کو کیا معلوم

کسے خبر ہے کہ بستی اداس ہے ساری
یہاں سے کون گیا ہے، ہوا کو کیا معلوم

وہ جس کو اوڑھ کے پھرتا ہے پاگلوں کی طرح
وہ دوسرں کی ردا ہے، ہوا کو کیا معلوم

خدا کا شکر کہ ہم سبز بخت ہیں دائم
یہ دل ہرے کا ہرا ہے، ہوا کو کیا معلوم

گلی گلی یہ صحیفے، روش روش یہ گلاب
در جمال کھلا ہے، ہوا کو کیا معلوم

یہ راز عشق ہے اور ہم امین ہیں اس کے
ہماری مٹھی میں کیا ہے، ہوا کو کیا معلوم

یہ جبر ذات یہ لب بستگی، یہ مہر سکوت
عجیب شور مچا ہے، ہوا کو کیا معلوم

تمہار قرب گھنے جنگلوں کی آسائش
تمہارا ہجر بلا ہے، ہوا کو کیا معلوم

یہ ہم جو پیرہن غم پہن کے بیٹھے ہیں
محبتوں کا صلہ ہے، ہوا کو کیا معلوم

میں اس کے دیدۂ حیراں کی دسترس میں ہوں
وہ مجھ کو دیکھ رہا ہے، ہوا کو کیا معلوم

چلو فقیرو! ذرا مے کدے سے ہو آئیں
یہ اذن ابر و ہوا ہے، ہوا کو کیا معلوم

کشاں کشاں جو لہو میں اترتا جاتا ہے
یہ کس کا حرف رسا ہے، ہوا کو کیا معلوم

خزاں کے دور میں ہم لہلہا رہے ہیں قیسؔ
ہمای ماں کی دعا ہے، ہوا کو کیا معلوم

غور سے ہم نے سنا کچھ بھی نہیں
جیسے لوگوں کا کہا کچھ بھی نہیں

شہر ہی چھوڑ دیا ہے اس نے
آپ کہتے ہیں ہوا کچھ بھی نہیں

ہم نے ہر گوشۂ جاں دیکھ لیا
اک محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

ہجرتیں چاٹ گئی ہیں مجھ کو
اور لوگوں کا گیا کچھ بھی نہیں

آنکھ بھی خالی ہے دل بھی خالی
تم سخی تھے تو دیا کچھ بھی نہیں

یہ دیا ہے، یہ دریچہ ہے، یہ میں
اور اس گھر میں رہا کچھ بھی نہیں

پر نکل آئیں تو اڑ جاتے ہیں
ان پرندوں میں وفا کچھ بھی نہیں

روشنی قیسؔ کہاں سے آئی
میرے اندر تو جلا کچھ بھی نہیں

❁

کیا زمیں پر اتر نہیں آیا
کیوں مرا چاند گھر نہیں آیا

ہم بہت انتظار کرتے رہے
اور کوئی لوٹ کر نہیں آیا

پھر ہوا یوں کہ تم نہیں آئے
پھر شجر پر ثمر نہیں آیا

بس یہی ہے کہ چل رہا ہوں میں
اور ابھی میرا گھر نہیں آیا

ایک دن ایک چاند دیکھا تھا
پھر مجھے کچھ نظر نہیں آیا

اس کو صحرا پکارتے ہی رہے
پھر وہ پاگل ادھر نہیں آیا

ہم بھی کتنے عجیب تھے کہ ہمیں
دوستوں سے بھی ڈر نہیں آیا

حرف الٹے لکھے ہوئے تھے قیسؔ
یوں غزل میں اثر نہیں آیا

وہ چڑیا جو روشندان میں رہتی ہے
اپنی جان تو اس کی جان میں رہتی ہے

ایک سخن رکھا ہے اس کے ہونٹوں پر
ایک غزل میرے دیوان میں رہتی ہے

سب چیزیں ترتیب سے رکھتا جاتا ہوں
بے ترتیبی سی سامان میں رہتی ہے

پھولوں کا اک باغ ہے میری مٹی میں
اک خوشبو میرے گلدان میں رہتی ہے

دیکھو اس کو بھول کے بھی ہم زندہ ہیں
جس کی یاد ہمیشہ دھیان میں رہتی ہے

روز ہوا کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہوں
اک خواہش تو ہر انسان میں رہتی ہے

جس کی خاطر مارے مارے پھرتے ہو
وہ لڑکی تو ایک مکان میں رہتی ہے

ہم اس کی باتوں پر دھیان نہیں دیتے
جس پاگل کی سوچ زبان میں رہتی ہے

نقلی چہرے سامنے آجاتے ہیں قیسؔ
بکنے والی چیز دکان میں رہتی ہے

✿

حوصلے پائے شل کے دیکھتے ہیں
دو قدم دور چل کے دیکھتے ہیں

جبر دیوار جاں کہاں تک ہے
گھر سے باہر نکل کے دیکھتے ہیں

پیاس اگنے لگی ہے آنکھوں میں
اپنے دریا بدل کے دیکھتے ہیں

قربتوں میں کرامتیں کیا ہیں
چاند کے ساتھ چل کے دیکھتے ہیں

کس کی خوشبو ہے ریشۂ گل میں
ہم ذرا پھول پھل کے دیکھتے ہیں

شاید اس کا سراغ مل جائے
کفِ افسوس مَل کے دیکھتے ہیں

آج کا دن گزارنا ہے ابھی
اور ہم خواب کل کے دیکھتے ہیں

آگ پانی میں کیوں نہیں لگتی
روز بارش میں جل کے دیکھتے ہیں

قیسؔ بازی تو ہار دی ہم نے
اب کوئی چال چل کے دیکھتے ہیں

❁

عذر ہوا نے کیا رکھا ہے
کیسا شور مچا رکھا ہے

اک بے نام تعلق میں بھی
خوف بچھڑنے کا رکھا ہے

دیکھو ہم نے اس لمحے کا
کتنا بوجھ اٹھا رکھا ہے

اس کی آنکھیں دیکھ رہا ہوں
جس نے جال بچھا رکھا ہے

دھوپ میں اس نے کس کی خاطر
چھت پر چاند اگا رکھا ہے

تم پاگل ہو تم کیا جانو
کس کے دل میں کیا رکھا ہے

ہم نے تیری خاطر ہی تو
آنکھوں میں رستا رکھا ہے

آج غزل کہنی تھی تم نے
تم کو پاس بٹھا رکھا ہے

قیسؔ اپنی دیوار میں ہم نے
ایک دیا دفنا رکھا ہے

ترے نثار! یوں ترے نثار کیسے ہوگئے
ہم آج اپنے ہاتھ سے فرار کیسے ہوگئے

یہ زندگی ہمیں گزار کر کہاں چلی گئی
خیال یار! ہم ترا شکار کیسے ہوگئے

سفر کی آرزو میں اک سفر تمام ہو چکا
تو ہم تری قطار میں شمار کیسے ہوگئے

یہ بوند بوند روشنی لہو میں کیا اتر گئی
ہم اپنے خاکدان میں شرار کیسے ہوگئے

سواد شام ہجر کی نفی بھی تو نہیں ہوئی
تو ہم سپرد زلف مشکبار کیسے ہوگئے

یہ کس دیے کے فیض نے ہمیں نہال کر دیا
گدائے شب چراغ رہگذار کیسے ہوگئے

دلوں میں یہ ملال رفتگاں کہاں سے آ گیا
ہم آج زندگی سے شرمسار کیسے ہوگئے

محبتوں کا واقعہ ہمیں پہ کیوں گزر گیا
تری طلب میں ہم گناہگار کیسے ہوگئے

تو حیرتوں کو آنکھ سے رہائی کون دے گیا
یہ سارے جبر آج اختیار کیسے ہوگئے

بکھر کے بھی تو خاک جاں ہوا کے دوش پر رہی
ہم اپنے آپ اتنے پائیدار کیسے ہوگئے

یہ موسم گلاب کی رتیں کہاں سے آ گئیں
اجڑ گئے تو لوگ شاندار کیسے ہوگئے

میں اپنے سارے دوستوں کے درمیان ہی تو تھا
مرے بدن پہ آج اتنے وار کیسے ہوگئے

وہ ایک شخص قیسؔ کارواں سے کیوں بچھڑ گیا
یہ ہجرتوں کے زخم آر پار کیسے ہوگئے

چاند سے دوستی نہیں کرتا
کون آوارگی نہیں کرتا

سو دراڑیں مرے وجود میں ہیں
میں کوئی غور ہی نہیں کرتا

دل اگرچہ شریر بچہ ہے
پر شرارت کوئی نہیں کرتا

مے کشی تو بہت ضروری ہے
شیخ یہ کام بھی نہیں کرتا

چشم حیرت کو انتظار تو ہے
پر تماشا کوئی نہیں کرتا

قیسؔ حد سخن میں رہتا ہوں
بات منہ سے بڑی نہیں کرتا

مبتلائے وصال ہوگیا ہے
دل کہ ایسا نہال ہوگیا ہے

یہ ہوائیں کہاں سے آتی ہیں
زخم پھر سے بحال ہوگیا ہے

آج خوشبو کو چھو لیا ہم نے
آج ہم سے کمال ہوگیا ہے

ایک دل کا ملال کیا کرتے
شہر ہی پائمال ہوگیا ہے

آج تم یاد آ رہے ہو بہت
آج پھر ایک سال ہوگیا ہے

اس قدر حبس ہے مرے اندر
سانس لینا محال ہوگیا ہے

ایک لمحہ سنبھال رکھا تھا
وہ بھی صرف جمال ہوگیا ہے

رات مے کے خمار میں گزری
دن سپرد ملال ہوگیا ہے

قیسؔ کتنا عزیز تھا وہ شخص
کیسے خواب و خیال ہوگیا ہے

مختصر نظمیں

مجبوری

جینے کی خواہش میں
مرنا تو پڑتا ہے

توڑ پھوڑ

اُس کے لہجے کی خاموشی
شور مچاتی ہے

کہانی

جب بھی
دو دل ملتے ہیں
ایک کہانی بنتی ہے

ردعمل

آنکھیں
روئیں تو اکثر
دھوپ نکل آتی ہے

تاکید

چلتے چلتے
اپنے گھر سے
دور کبھی مت جانا

لاحاصل

اک گندم کا دانہ
ایک شجر بن جائے
کچھ بھی ہاتھ نہ آئے

ایک سوال

سوچ رہے ہو
کیا سوچا ہے؟
اپنی عمر کے کتنے سال گنوا بیٹھے ہو!
چین سے جینا کب سیکھو گے!

سفر

مجھ کو پار جانا ہے
تیرے پاس آنا ہے
ہاتھ پاؤں شل ہیں مرے
اک سراب ہے آگے
میری روح پیاسی ہے
ریت کے سمندر میں تیرنا نہیں آتا

استفسار

یہ رستے
جو ہم کو لے کر
گھر سے دور نکل جاتے ہیں
کہاں جاتے ہیں؟

مشورہ

اک دن تم
ایسا ہی کرنا
اپنے دکھ کے سارے کنکر
میری آنکھوں میں
بھر دینا
پھر میری بینائی واپس آ جائے گی!

تعاقب

پھر مرے تعاقب میں
اک اداس چہرہ
زخم زخم یادوں کے جبر کی ردا اوڑھے
ہجر کی تمازت میں
وصل کی مسافت میں
بے ثمر محبت کی بے نشان گلیوں میں
ننگے پاؤں پھرتا ہے

انتظار

اور تم نہیں آتے
چاند ڈوب جاتا ہے
عمر بیت جاتی ہے
انتظار کی بازی راحت جیت جاتی ہے
جبر کا کڑا لمحہ
آس کا بجھا تارا
شام ہجر کا دریا
مجھ میں ڈوب جاتا ہے
اور تم نہیں آتے

فرار

شور!
شش جہات کا شور
کربِ حادثات کا شور
شومیٔ حیات کا شور
روح کے دریچوں میں اک سیاہ رات کا شور
ظرفِ کم کی ذات کا شور
ساری کائنات کا شور
یعنی بات بات کا شور
بھاگ کر
کہاں جاؤں؟

انجام

ایک صبح کا تارا
سر پہ آسماں اوڑھے
روشنی کے زینے سے روز اتر کے آتا ہے
اور اس نئے گھر کے
ادھ کھلے دریچے میں آ کے بیٹھ جاتا ہے
ہاتھ کے اشاروں سے
دائرے بناتا ہے
اور میں محبت کی بوند بوند کرنوں میں
روز ڈوب جاتا ہوں!

ھائیکو

اے مرے مولا
توہی جب رکھوالا ہے
پھر کیسا رولا

سوچوں کی حد ہیں
آپ کے صدقے میری ماں
آپ محمدؐ ہیں

بام علیؑ کا ہے
روشن تارے کے مانند
نام علیؑ کا ہے

یہ اللہ کی شان
دریا پر بارش برسے
اور دھرتی حیران

آنکھوں کا آزار
اے میرے پروردگار
یہ اونچی دیوار

کب پڑتا ہے ماند
خاک تو اڑتی رہتی ہے
پھر وہ چاند کا چاند

یہ کیسی برسات
آدھا سوکھا تن سائیں
آدھی گیلی رات

۞

ہم تو مالی ہیں
سائیں! ان میں کیا بوئیں
اکھیاں خالی ہیں

۞

لگ جا سینے سے
دشمن اچھا ہوتا ہے
یار کمینے سے

کچھ مت سوچا کر
دل پر اتنا بوجھ نہیں
جتنا دھرتی پر

یہ کیسا بھنبھوڑ
باہر اتنی خاموشی
اندر اتنا شور

کب شرمندہ ہے
آنکھ بچا کر اڑ جائے
وقت پرندہ ہے

اے سائیں بابا
چیلیں شور مچاتی ہیں
ان کو بھی سمجھا

پیچھے پڑ جانا
تتلی ہاتھ نہ آئے تو
واپس مت آنا

کس کو دیں خیرات
کس کی جھولی میں ڈالیں
ہجر کی لمبی رات

لوگ افسانے ہیں
دور سے بجنے والے سب
ڈھول سہانے ہیں

❁

تڑ کے تڑ کے جا
اس مالن سے تھوڑی سی
سندرتا لے آ

❁

خوب رلاتی ہے
اک بچپن کی یاد ہمیں
روز ستاتی ہے

لاکھ چھپائے بات
اک دن تو کھل جاتی ہے
بندے کی اوقات

❁

ایک مزے کی بات
جس نے ہریالی دیکھی
بھول گیا اوقات

❁

رنگ برنگے شور
دل میں ناچتے رہتے ہیں
امیدوں کے مور

سچ کو سچ میں تول
اچا بول کدے مت بول
ماٹی کا کیا مول

جب بھی شام ڈھلے
ہمسائے کی کھڑکی میں
باتی روز جلے

ساون کو ترسے
کب دھرتی کی پیاس بجھے
کب بادل برسے

اے بندہ پرور
اس نے مہر لگا دی ہے
دانے دانے پر

ایسا مت کرنا
دل خالی ہو جائے گا
آنکھیں مت بھرنا

سارے سچے ہیں
اب تو پیار کے رشتوں سے
دھاگے پکے ہیں

ماٹی کا کیا مول
سب کے سر پر چڑھ کر بول
سچ کو سچ میں تول

ہم بھی پگلے ہیں
دن کو چاند کی خواہش میں
گھر سے نکلے ہیں

آنا جانا کیا
روز کسی سے ملنے کا
روگ لگانا کیا

دل کی خیر منا
آنچل آنچل کرتا ہے
جا بادل بن جا

کیسی خوشبو ہے
یہ دھوکہ ہے آنکھوں کا
یا سچ مچ تو ہے

اپنی جان بچا
گھر کا سیدھا رستہ ہے
سیدھا سیدھا جا

دیکھنے والی ہیں
گورے گورے مکھڑے پر
زلفیں کالی ہیں

❁

قرضہ مانگا ہے
ہم نے آج سمندر سے
قطرہ مانگا ہے

❁

بھاگتے رہتے ہیں
آنکھیں سو جائیں تو ہم
جاگتے رہتے ہیں

سب کچھ پڑھ جانا
کچھ نہ سمجھ میں آئے تو
سولی چڑھ جانا

مرتا جاتا ہے
غزلیں لکھ لکھ کر پاگل
اُس کو سناتا ہے

جان سے پیارے ہیں
یہ جو میرے دریا کے
تین کنارے ہیں

دنیا دنیا دار
وقت پہ کس کے کام آئے
لکڑی کی تلوار

دیکھنے والی ہے
یار منافق ہیں اپنے
دھرتی کالی ہے

لوگ سوالی ہیں
کچھ خیرات ملے سائیں
جیبیں خالی ہیں

دیکھو تو بے جان
آنکھیں شور مچائیں تو
سن لیتے ہیں کان

❁

اچھا لگتا ہے
چاند ہماری بستی میں
روز نکلتا ہے

❁

وہ اندھا تھا کیا
پھر کیوں اس نے کھڑکی میں
چاند نہیں دیکھا

چھت پر اک تارا
تیری کھوج میں نکلا ہے
پاگل بنجارا

روز یہیں بسرام
پھر کھڑکی میں بیٹھی ہے
آس لگائے شام

رات نہیں بھاتی
اس کی یاد آتی ہے تو
نیند نہیں آتی

سمجھ نہ آئے بات
دن کس کا رستہ روکے
کس کو روئے رات

دیکھ لیا انجام
کس نے آگ لگائی تھی
کون ہوا بدنام

پھولوں کے گہنے
جس نے پہن لیے اک بار
پڑتے ہیں سہنے

گہرے سائے ہیں
ساری دنیا اپنی ہے
لوگ پرائے ہیں

❁

رام کہانی ہے
ہم نے سب کو پرکھا ہے
سب کی مانی ہے

❁

بس اتنی اوقات
دن کی گردن پر دیکھو
رات کے لمبے ہات

تم کو کیا معلوم
پتوں پر کیوں لکھتے ہیں
لوگ تمہارا نام

پیچھے سب سنسار
آگے آگے چلتا ہے
بندے کا کردار

ہم تو ہیں بدنام
شام سویرے لیتے ہیں
مے خانے کا نام

اے بستی والو!
ہم پردیس سے آئے ہیں
دروازہ کھولو

❁

بے کل ہوتے ہو
ہجر تو ہم نے کاٹا ہے
تم کیوں روتے ہو

❁

کیا ہم پاگل ہیں
چکر کاٹتے رہتے ہیں
تیری گلیوں کے

جیسے شاخ پہ بور
دل میں پھیلتا رہتا ہے
ہجرت کا ناسور

✿

یہ کیسا آزار
مرنے کی خواہش میں بھی
جینے کے آثار

✿

گانے گاتے ہیں
تم کو دیکھ کے پنچھی بھی
شور مچاتے ہیں

ایک دیے کی لَو
روز اشارے کرتی ہے
کھڑکی میں آ کر

❁

کیسے ہو آزاد
جس کی آنکھوں میں تیری
گلیاں ہوں آباد

❁

ہریالی بھی ہے
راتیں بھی ہیں ساون کی
دل خالی بھی ہے

رنگ برنگے پھول
ہونٹوں پر ساون کا رس
اور آنکھوں میں دُھول

❁

اپنے اپنے غم
تن پر پھولوں کی چادر
آنکھوں میں شبنم

❁

پیار وہیں ہوگا
پھول جہاں ہوں گے سائیں
خار وہیں ہوگا

ٹوٹتے رہتے ہیں
جیسے ہم انسان نہیں
کانچ کے برتن ہیں

اے بستی والو!
شام چراغ جلاؤ تو
کھڑکی میں رکھ دو

ان کو غور سے دیکھ
ان لوگوں کے چہروں پر
کتنے چہرے ہیں

باتوں پر مت جا
اندر سے سب کالی ہیں
راتوں پر مت جا

کس نے تنگ آ کر
اس کی نیت لکھ دی ہے
اس کے چہرے پر

کتنا بھاگے گا
جس نے جو کچھ بویا ہے
اتنا کاٹے گا

اپنے اپنے روگ
اندر سے سب خالی ہیں
اس بستی کے لوگ

بدلے لیتے ہیں
دھوکہ کھا کر لوگوں کو
دھوکے دیتے ہیں

کس کا رونا ہے
ساون کب کا بیت چکا
اب کیا ہوتا ہے

اڑ جاتے ہیں رنگ
اکثر دل کی چیزوں کو
کھا جاتا ہے زنگ

میں ہوں اپنے ساتھ
دونوں مل کر روکیں گے
تیز ہوا کا ہاتھ

کرنا ورنا کیا
اپنے سانپ سپولوں سے
ڈرنا ورنا کیا

خوب سجایا ہے
اس لڑکی نے ماتھے پر
چاند اگایا ہے

❁

اک پھیرا تے پا
سائیں سائیں کرتا ہے
بن تیرے صحرا

❁

آنکھوں میں چھاگل
دل میں یادیں بچپن کی
مٹھی میں بادل

اپنا پیا سا من
جب جب بادل کو ترسے
بھر جائے برتن

❁

غزلیں کہتے ہیں
اور جینے کی خواہش میں
مرتے رہتے ہیں

❁

یہ کیا کرتی ہے
چھت کو تکتی رہتی ہے
پاگل لڑکی ہے

تارا چمکا ہے
اندر اندر من سوچے
سندرتا کیا ہے

۞

شور مچا کر دیکھ
آگ لگائی ہے تو آ
ہاتھ جلا کر دیکھ

۞

چھوٹے چھوٹے ہیں
یہ جو میرے بونے ہیں
کتنے اچھے ہیں

چہرے اجیالے
باتیں ہیں روشن روشن
دل کالے کالے

آنکھ اٹھا کر دیکھ
یہ پنچھی سب پاگل ہیں
جال بچھا کر دیکھ

کیسے تیر تفنگ
بولو! کس نے جیتی ہے
سچائی سے جنگ

آخر ہار گئے
کچھ لوگوں کو لوگوں کے
صدمے مار گئے

برف نہیں پگھلی
کب سے میری آنکھوں میں
دھوپ نہیں نکلی

قطعات

صورت برگ حنا رکھی ہے
ساری چیزوں سے جدا رکھی ہے
ایک ٹوٹی ہوئی چوڑی میں نے
اپنے بستے میں چھپا رکھی ہے

❁

خود بخود راستے بناتے ہیں
دشت جاں میں اترتی جاتی ہے
قیس پردیس شاخ گل بھی نہیں
تیری خوشبو کہاں سے آتی ہے

اک تماشا بنا لیا اس نے
سوچتا ہوں یہ کیا کیا اس نے
پھر اسے چاند کی ضرورت تھی
پھر مجھے خرچ کر دیا اُس نے

❁

حادثہ تھا گزر گیا کب کا
ایک دل تھا سو مر گیا کب کا
جس کو عہد شباب کہتے ہیں
وہ سمندر اتر گیا کب کا

عشرت اعتبار دے مجھ کو
اے محبت! سنوار دے مجھ کو
جس کو چھو کر کبھی نہیں دیکھا
اس کے دل میں اتار دے مجھ کو

٭

ہم گلی کے فقیر ہیں سائیں
احترام حیات کرتے ہیں
روز اک حادثہ گزرتا ہے
روز اک واردات کرتے ہیں

زندگی بے شمار لوگوں کو
پستیوں میں اتار دیتی ہے
اپنی مرضی سے یہ نہیں مرتے
مصلحت ان کو مار دیتی ہے

بڑھ گئی دیوار جاں کی خستگی
دل کی ویرانی پہ رونا پڑ گیا
شوق نے مجھ میں دراڑیں ڈال دیں
پھر مجھے تقسیم ہونا پڑ گیا

اپنے لہجے میں جال رکھتا ہے
دل کو اونچا اچھال رکھتا ہے
جیسے ہم وقت کی امانت ہوں
وہ ہمیں یوں سنبھال رکھتا ہے

❁

حادثے جوں جوں جواں ہوتے رہے
بارشوں میں ہم دھواں ہوتے رہے
عمر ہم کو دیکھتی ہی رہ گئی
ہم مسلسل رایگاں ہوتے رہے

یونہی کب تک سراب دیکھیں ہم
اور کتنے عذاب دیکھیں ہم
اور ہمیں نیند بھی نہیں آتی
کس کی آنکھوں سے خواب دیکھیں ہم

یوں تو ہر غم قبول تھا دل کا
جانے کیسا اصول تھا دل کا
رات بھر غور سے سنا لیکن
سارا قصہ فضول تھا دل کا

بہت کچھ جاننے کو رہ گیا تھا
بہت کچھ سوچنے کو رہ گیا تھا
نہ جانے کیا سے کیا ہو جائیں گے ہم
یہی دن دیکھنے کو رہ گیا تھا

پستیوں میں اتر بھی سکتا ہے
اپنی حد سے گزر بھی سکتا ہے
ہم متاعِ عزیز بھی تو نہیں
وہ ہمیں خرچ کر بھی سکتا ہے

محبت میں کوئی تقصیر کرتے
جمال و رنگ کی تحقیر کرتے
ہوا سے بے خبر تھے لوگ ورنہ
تجھے پتوں پہ کیوں تحریر کرتے

اپنے دریا سراب کرتے ہیں
آنکھ کا احتساب کرتے ہیں
ہم جو اس طرح دیکھتے ہیں تمہیں
عادتیں ہی خراب کرتے ہیں

غرق حسن و جمال ہیں پیارے
ہجر میں بھی وصال ہیں پیارے
دونوں ہاتھوں سے لوٹ لے ہم کو
ہم غنیمت کے مال ہیں پیارے

آنکھ جب دیکھنے پہ راضی ہو
کوئی منظر برا نہیں ہوتا
مسئلہ سانپ کا ہے دنیا میں
ورنہ پتھر برا نہیں ہوتا

اس کا معیار رفاقت دیکھئے
دوستی کرتا ہے بازو دیکھ کر
لوگ کہتے ہیں بڑا ہشیار ہے
گھوم جاتا ہے ترازو دیکھ کر

❁

وہ صورت چاند سی ہے کیا بتائیں
محبت روشنی ہے کیا بتائیں
بڑھاپے نے مکمل کر دیا ہے
فقط اپنی کمی ہے کیا بتائیں

اِک مسلّم وجود ہے اپنا
ہم کسی شے میں ضم نہیں ہوتے
ٹوٹنے کے لیے بنے ہیں قیسؔ
ہم فقیروں میں خم نہیں ہوتے

کس کو دستِ رسا نہیں ملتا
آرزو ہو تو کیا نہیں ملتا
روشنی کو سنبھال کر رکھیے
ہر کسی کو دیا نہیں ملتا

زندگی کو مسترد کرتے رہے
اپنے اندر ہی سفر کرتے رہے
کام تو مشکل تھا لیکن کیا کریں
گھر کی دیواروں کو گھر کرتے رہے

❁

تیری خاطر سوچتا ہوں اور بس
تیرے حق میں بولتا ہوں اور بس
اور تو چھوٹا ہے سارے شہر سے
اور میں تجھ سے بڑا ہوں اور بس

حدودِ وقت پر ٹھہرا ہوا ہوں
میں اپنی راکھ پر بیٹھا ہوا ہوں
لکیروں میں مجھے تقسیم مت کر
میں تیرے ہاتھ کا لکھا ہوا ہوں

روشنی اختیار کر لینا
چاند پر انحصار کر لینا
دوستی کو خراب کرتا ہے
دوست پر اعتبار کر لینا

آرزوؤں کی ڈھیریاں کیا ہیں
خواہشیں مجھ کو تیریاں کیا ہیں
دل کو جھولے جھلا گئی ہیں قیس
یہ ثمردار بیریاں کیا ہیں

کون آئے گا دشت ہجراں میں
قربتوں کے گلاب بوئے گا
رات شبنم کو دھوپ چاٹ گئی
اب درختوں پہ کون روئے گا

کب کسی در کی گدائی کی ہے
کب کوئی سود و زیاں سوچا ہے
ہم ابھی حیرت اظہار میں ہیں
اپنے بارے میں کہاں سوچا ہے

پیکر نور و ضیاء لایا ہوں
غور سے دیکھ میں کیا لایا ہوں
یہ اندھیرا کہیں جاتا ہی نہ تھا
آج میں چاند اٹھا لایا ہوں

میں تو ناواقف فن ہوں مجھ میں
کون حرفوں کو سجا جاتا ہے
خود غزل کرتی ہے تخلیق مجھے
شعر خود مجھ میں سما جاتا ہے

بندش الفاظ نے اعصاب خستہ کر دیے
حرف علت نے مرا مصرعہ نکما کر دیا
قیسؔ لے ڈوبی مجھے بحر رمل کی سادگی
فاعلاتن فاعلن نے مجھ کو بوڑھا کر دیا

متفرقات

آؤ پنچھی بن جائیں
اُس نے جال بچھایا ہے

❁

چلو ان ہجرتوں کو پار کر لیں
انہی دریاؤں میں رستہ بھی ہوگا

❁

اس کے چہرے پہ چاند رکھا ہے
اور اس کو خیال کوئی نہیں

❁

کوئی تو ہے جو مرے آس پاس رہتا ہے
مرے قریب سے سائے گزرتے رہتے ہیں

جسے تم اتفاقاً چھو گئے تھے
شجر کی بس وہی ٹہنی ہری ہے

حادثہ بھی کوئی نہیں گزرا
شہر والے اداس ہیں سائیں

ہم نے دیکھا ہے ٹوٹتا اُس کا
کیا بدن کانچ کے بھی ہوتے ہیں

دیا جلا کے بڑی حیرتیں ہوئیں مجھ کو
ہوا کے ساتھ مری روشنی بھی چلنے لگی

شہر کی سر پھر ہواؤں کو
سامنا آج اک دیے کا ہے

❁

تم نہیں ہو تو یہ احساس ہوا
کتنی تنہائی میرے شہر میں ہے

❁

یہ جو ماہ وسال دکھائی دیتے ہیں
اپنے خدوخال دکھائی دیتے ہیں

❁

پتوں نے ہاتھ اٹھا کے دعائیں تو کیں بہت
بارش نہیں ہوئی یہ زمیں کا نصیب تھا

مجھ کو تو یہ دریا اچھا لگتا ہے
ڈوبنے والو تم کو کیسا لگتا ہے

تمام رات برستی رہی مری آنکھیں
تمہاری یاد نے سیراب کر دیا مجھ کو

اسے خبر ہے کہ میں ٹوٹنے ہی والا ہوں
سنبھال کر مجھے رکھتا ہے آئنے کی طرح

ترا جمال کبھی تو کرن کرن اترے
یہ میری آنکھیں بہت انتظار کرتی ہیں

اک سفینہ بھنور میں کیا ڈوبا
سارا دریا اُداس رہتا ہے

دھوپ دیوار تک چلی آئی
ترا آنچل کہاں گیا سائیں

رات شبنم کو کھا گیا سورج
اب درختوں پہ کون روئے گا

بس ایک داغ تھا وہ بھی نہیں رہا باقی
کسے خبر تھی کہ یوں بے چراغ ہونا تھا

جو یہ جھونکا ہوا کا لے گیا ہے
بھروسے کے سوا کیا لے گیا ہے

اب یہاں کون آنے والا ہے
کیوں دریچوں سے جھانکتے ہیں لوگ

اب تجھے ہم کہاں تلاش کریں
اب تو آنکھوں میں روشنی بھی نہیں

حوصلے ہار دیے تم نے بھی یہ کیسے ہوا
میں تو ہارا ہوا انسان تھا میرا کیا ہے

میں اپنے شعر میں سچ بولتا ہوں
یہی عادت مری سب سے بری ہے

❁

میری چھت پر کئی تارے ہیں ابھی
دو قدم پر ہے اجالا مجھ سے

❁

خشک آنکھوں سے کون روتا ہے
تم مری عادتوں پہ مت جانا

❁

وہ کرن بھی کہیں سے بھیج کبھی
جو مرے آر پار سے گزرے

چھت کو تکتے تکتے آنکھیں تھک جاتی ہیں
پھٹی پرانی یادیں اوڑھ کے سو جاتا ہوں

یہ ہم جو مبتلا غمِ آوارگی کے ہیں
کوتاہیاں ہوئی ہیں محبت نبھانے میں

غیر مطبوعہ کلام

فہرست

غزلیں

نظمیں

قطعات

……o……

غزلیں

آہٹیں سی سُن رہا ہوں گھر کے بیچ
میں اچانک سو گیا تھا در کے بیچ

روز اک آواز آتی ہے مجھے
کون بیٹھا ہے مرے پیکر کے بیچ

اُس کی آنکھیں اُس کا چہرہ اُس کا جسم
کتنے منظر تھے ہرے منظر کے بیچ

ہم بھی اپنی آنکھ میں آباد تھے
وہ بھی رہتا تھا کبھی اِس گھر کے بیچ

ہم نے دیکھے ہیں وہ شیشے کے بدن
پانی پانی ہو گئے پتھر کے بیچ

ڈوبنے کا سانحہ اپنی جگہ
کس کا دریا تھا تری گاگر کے بیچ

چین سے رہنے نہیں دیتی کبھی
اِک بلا ہے عاشقوں کے سر کے بیچ

مَے کشوں ! تم نے بھی دیکھیں ہیں کبھی
یہ جو دو آنکھیں ہیں اِک ساغر کے بیچ

شورشِ دِل ،کربِ جاں ، شوقِ وصال
تو نے کیا کیا رکھ دیا ہے پر کے بیچ

ہم بھی تو عاشق ہیں اُس کے نام کے
ہم کو بھی پتھر سے مارو سَر کے بیچ

ہم اصولوں کے بہت پابند تھے
فاصلہ رکھتے تھے خیر و شر کے بیچ

کچھ پرانے زخم چھپ جاتے ہیں قیسؔ
ورنہ کیا رکھا ہے اِک چادر کے بیچ

آئینے سے بال نکالتے پھرتے ہیں
اپنے دُکھ پر پردہ ڈالتے پھرتے ہیں

غزلیں کہنا سیکھ لیا ہے تو اَب ہم
تیرا ہجر وصال میں ڈھالتے پھرتے ہیں

جانے کس کی خاطر گھر سے نکلے تھے
گلیوں گلیوں خاک اُچھالتے پھرتے ہیں

روز آنگن میں پیڑ لگانا پڑتا ہے
پچھلی رُت کے زخم سنبھالتے پھرتے ہیں

مَے نوشی سے ہم لوگوں کو کیا مطلب
سر سے ایک بلا کو ٹالتے پھرتے ہیں

تم جن کو آوارہ سمجھتے ہو وہ لوگ
رات کی آنکھ میں کاجل ڈالتے پھرتے ہیں

اُن کا اصلی کام ڈرانا ہے ہم کو
کچھ پاگل تو کُتّے پالتے پھرتے ہیں

اِک مُٹھی میں رات چھپا رکھی ہے قیسؔ
اِک مُٹھی سے چاند اُچھالتے پھرتے ہیں

عجیب جبر کا منظر دکھائی دیتا ہے
ہر ایک شاخ پہ پتھر دکھائی دیتا ہے

رُکا ہُوا ہوں مگر اِک سفر میں شامل ہوں
قدم قدم پہ مجھے گھر دکھائی دیتا ہے

جو آسمان کے نیچے نظر نہیں آتا
وہ آسماں کے برابر دکھائی دیتا ہے

کسی کسی کو یہ آنکھیں نہال کرتی ہیں
کسی کسی کو سمندر دکھائی دیتا ہے

تمام عمر جسے غور سے نہیں دیکھا
وہ شخص اَب مرے اندر دکھائی دیتا ہے

اُجڑ گئے ہیں تو چُپ ہیں مرے در و دیوار
بَس ایک شور جو اکثر دکھائی دیتا ہے

میں اپنی ذات میں تقسیم ہو گیا ہوں قیسؔ
مرا پرندہ مجھے پر دکھائی دیتا ہے

اپنے درد مثالی کر لیتا ہوں میں
دونوں آنکھیں خالی کر لیتا ہوں میں

اِس سے پہلے سورج گھر تک آ پہنچے
سب دیواریں کالی کر لیتا ہوں میں

اُس بد صورت شخص کا یہ احسان تو ہے
لہجہ اور جمالی کر لیتا ہوں میں

جب اُس چھت پر چاند اُترنے والا ہو
آنکھیں دیکھنے والی کر لیتا ہوں میں

وقت پڑے تو کوئی کام نہیں آتا
خود اپنی رکھوالی کر لیتا ہوں میں

اپنے رب سے مانگنے جاتا ہوں تو قیسؔ
دونوں ہاتھ سوالی کر لیتا ہوں میں

اپنے گرد و غبار سے گزرے
قافلے کس وقار سے گزرے

کوئی حیرت اُتار دے سائیں
جو مرے آر پار سے گزرے

اَب کے انتظار ہے میرا
کون لمبی قطار سے گزرے

وہ پیمبر تھا اور ہار گیا
ہم کئی بار دار سے گزرے

پانیوں میں اُتار دیتا ہے
جبر جب اِختیار سے گزرے

سب تری ذات کا حوالہ تھے
جتنے لمحے شمار سے گزرے

قیسؔ دستِ رسا کی حاجت ہے
جو گریباں کے تار سے گزرے

❁

بن جاتے ہیں ایسے کچھ حالات سَمُندَر میں
لے آتا ہے جب کوئی بارات سَمُندَر میں

اب لہروں کا راز کھلے گا طوفانوں کے بیچ
اب ہم لے آئے ہیں کشتی سات سَمُندَر میں

شاید کوئی ڈوب رہا ہے پھر ساحل کے پاس
دیکھ رہا ہوں لمبے لمبے ہاتھ سَمُندَر میں

پھر سوہنی کا عشق اذانیں دے گا لہروں پر
پھر کوئی لکھ جائے گا آیات سَمُندَر میں

کچی ہو تو وقت گھڑے کا ساتھ نہیں دیتا
کُھل جاتی ہے مٹی کی اوقات سَمُندَر میں

کبھی کبھی تو پانی اُس کی آنکھ سے بہتا ہے
کبھی کبھی تو ہوتی ہے برسات سَمندر میں

عشق نبھانا ہو تو کوئی مشکل کام نہیں
لوگ بہا دیتے ہیں ہر سوغات سَمندر میں

اِک دن سورج چلتے چلتے تھک جاتا ہے قیسؔ
آخر اِک دن ہو جاتی ہے رات سَمندر میں

✿

بند آنکھوں سے مت دیکھا کر مر جائے گا
اُلٹا سیدھا مت سوچا کر مر جائے گا

جن لفظوں سے شعر سجانا نا ممکن ہو
ایسی غزلیں مت لکھا کر مر جائے گا

دیکھ گلی میں کتنی تیز ہَوا چلتی ہے
گھر سے باہر مت نکلا کر مر جائے گا

اس کے رستے میں دریا پڑتا ہے سائیں
اس کا رستہ مت دیکھا کر مر جائے گا

وہ جو چھت پر چاند اُگانے آ جاتے تھے
اُن کی خاطر مت رویا کر مر جائے گا

بستی میں کچھ لوگ منافق بھی ہوتے ہیں
اپنے آپ سے مت جھگڑا کر مر جائے گا

دھوپ نکلتی ہے تو آنکھیں کھا جاتی ہے
ہر سورج کو مت پُوجا کر مر جائے گا

ہنس کر ملنے والے سب اچھے ہوتے ہیں
سب کو اچھا مت سمجھا کر مر جائے گا

تم سے پہلے بھی بچوں نے بھی خواہش کی تھی
چاند کے پیچھے مت بھاگا کر مر جائے گا

تیرے اندر بھی تو ایک بلا ہے تیری
پیچھے مُڑ کر مت دیکھا کر مر جائے گا

ہم جیسے نایاب نہیں ہیں تُو بھی سائیں
ریت میں موتی مت ڈھونڈا کر مر جائے گا

مَے نوشی کی عادت قیسؔ بری عادت ہے
اُلٹا سیدھا مت بولا کر مر جائے گا

٭

دھیان جب آپ کا نہیں ہوتا
تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا

اُس طرف کھینچتے ہیں پاؤں مجھے
جس طرف راستہ نہیں ہوتا

عمر بھر کی جدائیاں تو ہیں
عشق میں کیا سے کیا نہیں ہوتا

چاند کس راستے سے آ جائے
روشنی کو پتا نہیں ہوتا

اپنی مٹی عجیب تھی ورنہ
زخم اتنا بڑا نہیں ہوتا

روشنی کے اسیر ہیں سارے
اور کوئی چاند سا نہیں ہوتا

آئینہ بار بار دیکھتا ہوں
کوئی تیرے سِوا نہیں ہوتا

اپنے بارے میں اور کیا سوچیں
سوچ کر فائدہ نہیں ہوتا

اُس طرف بار بار مت جاؤ
ساتواں در کھلا نہیں ہوتا

قیس کس کس سے شکایتیں کرتے
کون کھوٹا کھرا نہیں ہوتا

٭

ایک گلی میں گھر ہوتا تھا
جس میں ایک شجر ہوتا تھا

بانس کی اک چلمن ہوتی تھی
چلمن میں اک در ہوتا تھا

اُس میں اک چڑیا رہتی تھی
جس کا نام سحر ہوتا تھا

اُس کی باتیں یاد آتی ہیں
اُس کا حرف ہُنر ہوتا تھا

سر میں ایک بلا ہوتی تھی
پیروں میں چکّر ہوتا تھا

ہم دونوں چھپ کر ملتے تھے
ماں کا کتنا ڈر ہوتا تھا

رات آنکھوں میں کٹ جاتی تھی
سورج نیزے پر ہوتا تھا

اَن دیکھی خوشیاں ہوتی تھیں
اَن دیکھا منظر ہوتا تھا

وہ شیشے کی بن جاتی تھی
اور میں شیشہ گر ہوتا تھا

ہم دونوں بیٹھے رہتے تھے
ساری رات سفر ہوتا تھا

سانس بدن میں رُک جاتی تھی
میں پتھر پتھر ہوتا تھا

پھر ہم قیسؔ بچھڑ جاتے تھے
اور ایسا اکثر ہوتا تھا

ہم کیا کرتے شوق نبھانا پڑتا ہے
اُس کی خاطر چاند پہ جانا پڑتا ہے

روز آنگن کی پہلی دھوپ سے لڑتا ہوں
روز آنکھوں میں پیڑ لگانا پڑتا ہے

اپنی جانب روز سفر کرتا ہوں مَیں
گو رستے میں ایک زمانہ پڑتا ہے

ہم تو وہ آزاد پرندے ہیں جن کو
اپنی خاطر جال بچھانا پڑتا ہے

یہ تو آنے والا وقت بتائے گا
کس کو پہلا تیر چلانا پڑتا ہے

آ کر دیکھو اَب ہم سہل نشینوں کو
ہر نقطے کا بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے

کتنے کام اَدھورے رہ جاتے ہیں قیسؔ
روز گلی میں آنا جانا پڑتا ہے

ہاں مری جان بہت ہوتا ہے
آپ کا دھیان بہت ہوتا ہے

پیار سے ہم جسے دِل کہتے ہیں
تجھ پہ قربان بہت ہوتا ہے

یہ محبت بھی بُری عادت ہے
اِس میں نقصان بہت ہوتا ہے

وہ ملاقات بھی نہیں ہوتی
جس کا اِمکان بھی بہت ہوتا ہے

ایک مشکل سی پڑی رہتی ہے
کام آسان بہت ہوتا ہے

اپنے بارے میں اور کیا سوچیں
دِل پریشان بہت ہوتا ہے

قیسؔ ترتیب سے کیا کیا رکھیں
گھر میں سامان بہت ہوتا ہے

ہجرتوں کا ملال کوئی نہیں
کس کے شیشے میں بال کوئی نہیں

صورتیں ہی بگاڑ دیتا ہے
آئینے میں کمال کوئی نہیں

جو بھی ملتا ہے حال پوچھتا ہے
اَب مرا حال وال کوئی نہیں

چشمِ حیرت میں کیا نہیں ہوتا
کس کو شوقِ وصال کوئی نہیں

مجھ کو لوحِ زمین پر لکھ دو
مجھ سے بہتر سوال کوئی نہیں

اُس کے چہرے پہ چاند لکھا ہے
اور اُس کو خیال کوئی نہیں

پسِ منظر کوئی تو رہتا ہے
آپ اپنی مثال کوئی نہیں

آؤ اُس شخص کو تلاش کریں
جس کی مُٹھی میں جال کوئی نہیں

بس حوالے ہی رہ گئے ہیں قیسؔ
خون کا رنگ لال کوئی نہیں

حصارِ جسم و جان سے گزر گئے
ہم آج امتحان سے گزر گئے

زمیں پہ دو قدم نہیں چلا گیا
نشے میں آسمان سے گزر گئے

سکونِ دل جہاں جہاں نہیں ملا
تو لوگ اس دکان سے گزر گئے

مزاج دھوپ کا بھی کچھ عجیب تھا
تو ہم بھی سائبان سے گزر گئے

جو وارداتِ قلب کے امین تھے
وہ ذائقے زبان سے گزر گئے

جدائیوں کا اک ملال رہ گیا
وہ حادثے نشان سے گزر گئے

جہاں پہ قیسؔ کوئی راستہ نہ تھا
فقیر کتنی شان سے گزر گئے

جب بھی دل کے قریب ہوتے ہیں
حادثے کچھ عجیب ہوتے ہیں

سب کے گھر میں دِیا نہیں جلتا
اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں

جن کے وارث وفا سے عاری ہوں
وہی بچے غریب ہوتے ہیں

آپ کا اعتبار کیا کرتے
دوست بھی تو رقیب ہوتے ہیں

زندگی درسِ آگہی بھی تو ہے
وہ جو اپنے حسیب ہوتے ہیں

مُڑ کے واپس کوئی نہیں آتا
دل کے رستے عجیب ہوتے ہیں

خوف اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے
لوگ جتنا قریب ہوتے ہیں

جیسا جیسا مرض ہو قیسؔ ہمیں
ویسے ویسے طبیب ہوتے ہیں

قیسؔ جن کے گھڑے ہی کچے ہوں
پانیوں کا نصیب ہوتے ہیں

جب کسی حرف میں فَن بولتا ہے
کوئی شیشے کا بدن بولتا ہے

اک بلندی ہے مری پستی میں
میری دھرتی پہ گگن بولتا ہے

یہ خموشی تو ردا ہے میری
مجھ میں ادراکِ سخن بولتا ہے

پھر مہکتی ہے کسی درد کی آنچ
پھر کوئی زخمِ کہن بولتا ہے

ایک ہی سر ہے مرے کان کے بیچ
جو چھناں چھن چھنا چھن بولتا ہے

تیری خوشبوئیں بلاتی ہیں مجھے
جب وہ غنچے کا دہن بولتا ہے

اپنی ہریالی میں آباد ہوں قیسؔ
میرے پتوں میں چمن بولتا ہے

کوئی سیراب کرے گا مجھ کو
آج بارش کا چلن بولتا ہے

قیسؔ یہ ماں کی دعا ہے شاید
میری مٹی میں جو دھن بولتا ہے

کل تک جو تیری آنکھوں پر سب کچھ وار گیا تھا
دل والوں کا اس بستی سے کاروبار گیا تھا

جن لوگوں کی دیواروں سے شیشے جھانک رہے تھے
ان لوگوں کے گھر میں کوئی پتھر مار گیا ہے

بند آنکھوں سے ہم نے کیا کیا منظر دیکھ لئے تھے
سوچنے بیٹھے ہیں تو آج کا دن بیکار گیا ہے

اک اک کر کے پیار کے سارے رشتے ٹوٹ گئے تھے
دل کی باتیں کرنے والا سب کچھ ہار گیا تھا

بائیں آنکھ پھڑکتی ہے تو ڈر جاتا ہوں
تجھ سے ملنے پھر کوئی دریا کے پار گیا تھا

کیا زمیں پر اُتر نہیں آیا
کیوں مرا چاند گھر نہیں آیا

ہم بہت انتظار کرتے رہے
اور کوئی لوٹ کر نہیں آیا

پھر ہُوا یوں کہ تم نہیں آئے
پھر شجر پر ثمر نہیں آیا

بس یہی ہے کہ چل رہا ہوں میں
اور ابھی میرا گھر نہیں آیا

حرف اُلٹے لکھے ہوئے تھے قیسؔ
یوں غزل میں اثر نہیں آیا

لاکھ چاہا مگر نہیں آئے
کیسے کیسے ہُنر نہیں آئے

پھر کوئی واقعہ نہیں گزرا
پھر شجر پر ثمر نہیں آئے

کچھ گلوں پر مہک نہیں اُتری
کچھ پرندوں کو پر نہیں آئے

ایک دن اک سفر پہ نکلے تھے
اور ہم لَوٹ کر نہیں آئے

آنکھ اُٹھا کر بھی کچھ نہیں دیکھا
کتنے منظر نظر نہیں آئے

عمر ساری مکان میں گزری
ہم کبھی اپنے گھر نہیں آئے

موسمِ رنگ و بُو چلا بھی گیا
آپ کیا سوچ کر نہیں آئے

قیسؔ گھر میں بڑا اندھیرا تھا
میرے جگنو اِدھر نہیں آئے

❁

لے اُڑا شوقِ انتہا مجھ کو
دیکھتی رہ گئی ہَوا مجھ کو

ایک ہجرت کو پار کرنا تھا
اِک زمانہ گزر گیا مجھ کو

گھر کی جانب قدم نہیں اُٹھتے
روک لیتا ہے راستہ مجھ کو

یہ پرائی محبتیں کیا ہیں
دُور تک سوچنا پڑا مجھ کو

تجھ سے ملنا بہت ضروری تھا
حوصلہ ہی نہیں رہا مجھ کو

اُس کی آنکھوں میں اک بشارت تھی
اور اِک روگ لگ گیا مجھ کو

میں تو پاگل تھا اور لوگوں نے
سوچنے ہی نہیں دیا مجھ کو

اپنے پیچھے چھپا ہُوا تھا مَیں
پھر کہاں ڈھونڈتی ہَوا مجھ کو

پھر اُسے چاند کی ضرورت تھی
اُس نے پھر خرچ کر دیا مجھ کو

قیسؔ وہ روشنی تھی گلیوں میں
گھر کا رستہ نہیں ملا مجھ کو

مرے حصار کی مٹی ہَوا کا پر لے جائے
مجھے پسند کرے اور اپنے گھر لے جائے

اسے خبر ہے کہ مَیں اس کی دسترس میں ہوں
اَب اس کی مرضی ہے چاہے مجھے جدھر لے جائے

وہ ایک دن مرے شہرِ فراق سے گزرے
مری دکان سے مجھ کو خرید کر لے جائے

مَیں اپنے اشکِ ملامت کے ساتھ زندہ ہوں
وہ چاہتا ہے مری شاخ سے ثمر لے جائے

مَیں کیا کروں گا یہ کاغذ کی کشتیاں لیکر
وہ آئے اور مری آنکھ سے بھنور لے جائے

مَیں مشتِ خاک ہوں چھونے سے ٹوٹ سکتا ہوں
بہت سنبھال کے مجھ کو وہ کوزہ گر لے جائے

بس ایک پھول کی خوشبو دکھائی دیتی ہے
وہ ایک پھول جو مجھ کو شجر شجر لے جائے

مَیں دشتِ عمر میں تنہا کھڑا ہُوا ہوں قیسؔ
کوئی تو ہو جو مرے حال کی خبر لے جائے

مبتلائے وِصال ہوگیا ہے
دِل کہ ایسا نہال ہو گیا ہے

آج خوشبو کو چُھو لیا ہم نے
آج ہم سے کمال ہو گیا ہے

آج تم یاد آ رہے ہو بہت
آج پھر ایک سال ہو گیا ہے

اس قدر حبس ہے مرے اندر
سانس لینا محال ہو گیا ہے

ایک لمحہ سنبھال رکھا تھا
وہ بھی حرفِ جمال ہو گیا ہے

رات مَے کے خمار میں گزری
دن سپردِ ملال ہو گیا ہے

اشتہا بھی نہیں رہی باقی
زخم رزقِ ملال ہو گیا ہے

قیسؔ کتنا عزیز تھا وہ شخص
کیسے خواب و خیال ہو گیا ہے

اُڑتا اُڑتا پھرتا ہوں
سُوکھے پتوں جیسا ہوں

جانے کیا مجبوری ہے
چھت کو تکتا رہتا ہوں

اَب تو تم بھی ساتھ نہیں
اَب مَیں کیسا لگتا ہوں

کس موسم کے بادل تھے
کس بارش میں بھیگا ہوں

ریت اُڑتی ہے آنکھوں میں
صحرا صحرا کرتا ہوں

آ کر مجھ کو لے جاؤ
گھر میں بیٹھا رہتا ہوں

کون اُٹھائے گا مجھ کو
اپنی راکھ پہ بیٹھا ہوں

میں اس کا دریا ہوں قیسؔ
اپنے اندر بہتا ہوں

اس کے گھر کا رستہ باندھ کے رکھا ہے
ہم نے آنکھ میں دریا باندھ کے رکھا ہے

تیری آنکھیں تیرا چہرہ باندھ کے رکھا ہے
ہم نے اِک چادر میں کیا کیا باندھ کے رکھا ہے

پھر ہم اپنے وہم و گماں سے الجھے ہیں
اس مٹی میں سونا باندھ کے رکھا ہے

وہ آئے تو پھر ہم مل کر ڈوبنے جائیں گے
میں نے ان آنکھوں میں دریا باندھ کے رکھا ہے

ہاتھ سے ہم نے سارے منظر چھو کے دیکھیں ہیں
تیرے نام سے زخم پرانا باندھ کے رکھا ہے

جانے کب ہم اس مُٹھی کو کھول کے دیکھیں
جس مُٹھی میں جبر ہَوا کا باندھ کے رکھا ہے

ایک شجر کا سایہ اپنے گھر میں ہے موجود
جس ٹہنی سے پتا پتا باندھ کے رکھا ہے

اب آنکھوں کی بینائی سے ڈر جاتا ہوں میں
جن آنکھوں سے گھر کا رستہ باندھ کے رکھا ہے

اس دنیا سے سارے رشتے توڑ دیئے ہیں قیسؔ
اک لڑکی سے درد کا رشتہ باندھ کے رکھا ہے

پسِ دیوار اِک چہرہ بھی ہوگا
کسی نے چاند کو دیکھا بھی ہوگا

چلو ان ہجرتوں کو یاد کر لیں
اپنے دریاؤں میں رستہ بھی ہوگا

تعلق ہے تو اندیشے بھی ہوں گے
یہ دِل شیشہ ہے تو میلا بھی ہوگا

یہ اِک جنگل جو میرے وہم کا ہے
یہ مجھ میں دُور تک پھیلا بھی ہو گا

عجب خوش فہمیوں میں مبتلا ہوں
کہ میرے شہر میں دریا بھی ہوگا

دراڑیں سی جو مجھ میں پڑ گئی ہیں
کوئی سامان شیشے کا بھی ہو گا

یہ آنکھیں جو لکیریں کھینچتی ہیں
محبت کا کوئی نقشہ بھی ہوگا

کوئی تو قیس اس پاگل سے کہہ دے
شجر ہوں گے تو پھر سایہ بھی ہوگا

روشنائی کے کاروبار کرو
پھر کسی چاند کو شکار کرو

رات کی آنکھ میں اُتر جاؤ
کوئی حیرت سپردِ بار کرو

ہو سکے تو سفر سے لوٹ آؤ
کسی لمحے کو شاندار کرو

ہم کسی خواب کے خیال میں ہیں
تم ذرا دیر انتظار کرو

شور ہَوا کا روز سفر میں رہتا ہے
کیسا منظر میرے سر میں رہتا ہے

ایک پری رہتی ہے چاند کی وادی میں
اک رستہ پنچھی کے پر میں رہتا ہے

کچی مٹی کی خواہش تو جو بھی ہو
بارش کا امکان تو سر میں رہتا ہے

ایک بلا رہتی ہے میرے جنگل میں
اک آسیب مرے پتھر میں رہتا ہے

میں اپنی سوچوں سے ڈرتا رہتا ہوں
میرا دشمن میرے گھر میں رہتا ہے

ہم تو اس سے ملنے روز آتے ہیں قیسؔ
تم کیا جانو کون شجر میں رہتا ہے

تقاضے کچھ نہیں جھگڑا بہت تھا
وہ خالی ظرف تھا بجتا بہت تھا

اسے بیساکھیاں مہنگی پڑی تھیں
شجر دیوار سے اُونچا بہت تھا

مجھے سیراب تو کرنا تھا اس نے
وہ میرے ساتھ کل رویا بہت تھا

اسے بھی زخم تھے پچھلی رُتوں کے
ہمیں بھی مسئلہ دل کا بہت تھا

چمک اس میں بھی تھی تلوار جیسی
وہ سونا تھا مگر سستا بہت تھا

اسے شوقِ ہوا نے مار ڈالا
جو بے پر تھا وہی اُڑتا بہت تھا

وہ اپنا دوست ہے ہم جانتے ہیں
وہ سچا ہے مگر جھوٹا بہت تھا

عجب خدشات سے لاحق ہیں اس کو
وہ آئینے سے اَب ڈرتا بہت تھا

یہ اس کی سادگی تھی بے حسی میں
خجالت کھینچ کر ہنستا بہت تھا

اسے کچھ زعم تھے بے ربطگی کے
وہ اپنی بات دہراتا بہت تھا

منافق ہم اسے کیسے کہیں قیسؔ
وہ اوچھا تھا مگر اچھا بہت تھا

تو اَب ہم اس قدر دل گیر ہیں کیا
ہَوا کی دسترس میں تیر ہیں کیا

یہ ہم جو حیرتوں میں جی رہے ہیں
ہمیں خدشات دامن گیر ہیں کیا

بس اپنا ہی تعاقب کر رہے ہیں
ہم اپنے خواب کی تعبیر ہیں کیا

لکیریں کھینچ دیتی ہیں دلوں پر
یہ آنکھیں کاتبِ تقدیر ہیں کیا

پسِ دیوارِ جاں جو دیکھتا ہوں
یہ سب منظر تری تحریر ہیں کیا

جو شَوقِ رزق میں مارے گئے تھے
وہ سارے لوگ بے تقصیر ہیں کیا

یہ جتنے قیسؔ ہیں دشتِ طلب میں
یہ سب پاگل تری جاگیر ہیں کیا

تم پر مر کے دیکھیں گے
کوشش کر کے دیکھیں گے

پیڑ لگا کے بیٹھے ہیں
سائے سر کے دیکھیں گے

دُکھ بھی گھر کا دیکھا ہے
سُکھ بھی گھر کے دیکھیں گے

تتلی چھت پر آئے گی
منظر پر کے دیکھیں گے

ان ناممکن باتوں کو
ممکن کر کے دیکھیں گے

ڈوب گئے تو ڈوب گئے
پار اُتر کے دیکھیں گے

خواب سہانے ہوں تو قیسؔ
چاند نگر کے دیکھیں گے

✿

وہ کارِ شوق سر بہ سر بھی کیا ہُوا
بدن بدن تراش کر بھی کیا ہُوا

وہ صورتیں وہ مورتیں بھی کیا ہوئیں
وہ خاکِ نم وہ کوزہ گر بھی کیا ہُوا

ضرورتیں ضرورتوں کو کھا گئیں
محبتیں شمار کر بھی کیا ہُوا

تلاشِ عمرِ رائیگاں فضول تھی
وہ ایک شخص در بدر بھی کیا ہُوا

بڑی شکائتیں تھیں آسمان سے
مگر مری زمین پر بھی کیا ہُوا

وہ ہم بھی کیا ہوئے کہ ہم نہیں رہے
وہ سبز باریاں وہ گھر بھی کیا ہُوا

غزل کہی تو زخم پھوٹنے لگے
ملالِ حرفِ بے ضرر بھی کیا ہُوا

ہم اپنے آس پاس ہی بکھر گئے
وہ ایک پَل اِدھر اُدھر بھی کیا ہُوا

گلی میں اک چراغ بھی نہیں تھا قیسؔ
تمام رات کا سفر بھی کیا ہُوا

یہ جو شوق وصال رکھا ہے
دل میں رستہ نکال رکھا ہے

راحت قرب یار نے ہم کو
اور اونچا اچھال رکھا ہے

آ کے دیکھو یہ ہم جو زندہ ہیں
خون کا رنگ لال رکھا ہے

ہم غزل کا شکار کرتے ہیں
اپنی پوروں میں جال رکھا ہے

کتنا آسان شخص تھا وہ شخص
جس نے مشکل میں ڈال رکھا ہے

لوگ اپنا خیال کیا رکھتے
تم نے کس کا خیال رکھا ہے

لوگ تقسیم ہو گئے ہیں قیسؔ
جب سے شیشے میں بال رکھا ہے

یہ خوشبو عام کیا ہے
ترا پیغام کیا ہے

نشے میں لوگ کیوں ہیں
یہ رقصِ جام کیا ہے

اُسے دریافت کرلو
ذرا سا کام کیا ہے

یہ میرے خواب کیا ہیں
خیالِ خام کیا ہے

یہی تو سوچتا ہوں
یہ صبح و شام کیا ہے

مجھے تم جانتی ہو
بتاؤ کام کیا ہے

تم اچھی لگ رہی ہو
تمھارا نام کیا ہے

اگر میں قیسؔ ہوں تو
مرا ہمنام کیا ہے

یہ ضروری ہے دھیان کھول کے بیٹھ
مل گیا ہے تو کان کھول کے بیٹھ

دھوپ خیمے لگا کے بیٹھی ہے
اَے زمیں آسمان کھول کے بیٹھ

کیا خبر آخری بشارت ہو
نا خدا بادبان کھول کے بیٹھ

وہ خریدار ہے تو آئے گا
روز اپنی دوکان کھول کے بیٹھ

ہجرتوں کا شکار کرنا ہے
اَے شکاری مچان کھول کے بیٹھ

کوئی تازہ ہَوا بھی آنے دے
اپنا کچّا مکان کھول کے بیٹھ

جو غمِ رفتگاں میں گزری ہے
آج وہ داستان کھول کے بیٹھ

اس میں کیا کیا چھپا کے رکھا ہے
قیسؔ یہ خاک دان کھول کے بیٹھ

نظمیں

سوال

بے کراں اندھیرے میں
چشمِ نم کے گھیرے میں
ایک لَو تھرکتی ہے
اک چراغ جلتا ہے
میرے گھر کے آنگن میں
روشنی اُترتی ہے
جو مجھے بُلاتی ہے
نیند سے جگاتی ہے
ہاتھ کے اِشاروں سے
دائرے بناتی ہے
مجھ میں پھیل جاتی ہے
رفتگانِ شہرِ ملال
اِک سوال ہے تم سے
یہ جو روشنی سی آتی ہے
جو مجھے بُلاتی ہے
نیند سے جگاتی ہے
مجھ میں پھیل جاتی ہے
یہ کہاں سے آتی ہے

''موسیٰ کی ماں''

ساری مائیں اک جیسی ہیں
سب کی دعائیں اک جیسی ہیں
سب کے دل میں اک جیسی ممتا رکھی ہے
سب کے پاؤں کے نیچے اک جیسی جنّت ہے
ساری مائیں موسیٰ کی ماں جیسی ہیں
پر یہ ساری مائیں
کب زندہ رہتی ہیں
میری ماں بھی میری خاطر
روز دعائیں کرتی تھی
اندر اندر مرتی تھی
میں بھی اُس کا موسیٰ تھا

قطعات

روزنِ ذات میں رہنا نہیں آیا مجھ کو
برے حالات میں رہنا نہیں آیا مجھ کو
اس نے آدابِ محبت نہیں سیکھے اَب تک
اپنی اوقات میں رہنا نہیں آیا مجھ کو

آنکھ کو صَرفِ راہ کرتے رہے
روشنی کا گناہ کرتے رہے
چاند بیٹھا رہا دریچے میں
اور ہم واہ واہ کرتے رہے

ہم انتہائے شوق میں بکھر گئے
محبتوں کی تازگی سی رہ گئی
خمار سے لپٹ گیا چراغِ شب
شراب ہم کو دیکھتی سی رہ گئی

ہر اک سوال کا جواب لے کے آیا ہوں
اے محتسب حساب لے کے آیا ہوں
تری جبارتوں کا امتحان ہے
یہ دیکھ میں شراب لے کے آیا ہوں

ایک دن یہ چناب کا پانی
میری میّت اُٹھانے آئے گا
میری مٹّی میں اک گھڑا ہے قیسؔ
مجھ کو دریا بلانے آئے گا

کسی کو ہاتھ مت دو
کوئی سوغات مت دو
جسے پرکھا نہیں ہے
اس خیرات مت دو

یہ کس کا احسان ہُوا تھا
دل کتنا ویران ہُوا تھا
تجھ سے مل کر سوچ رہا ہوں
میرا کیا نقصان ہُوا تھا

ہَوا کے دوش پر اگر سوار ہے
تو وہ زمین کا شکار ہے
تری شراب میں کہیں نہیں
تو وہ خمار بھی کوئی خمار ہے

ہم اپنے ہی سفر میں مبتلا تھے
ہمارا مسئلہ کچھ بھی نہیں تھا
جدائی کا سبب کچھ بھی رہا ہو
ہمیں بھولا ہُوا کچھ بھی نہیں تھا

پھول باقی ہیں خار باقی ہیں
کتنے نقش و نگار باقی ہیں
ایک دیوار گر گئی تو کیا
اور کتنے حصار باقی ہیں

اپنی دیوار کا نوشتہ ہوں
اپنے ثابت کا بیش و کم ہوں میں

زندگی حرف حرف گزری ہے
اپنے اوراق میں رقم ہوں میں

کلیاتِ
سعید قیس